بیادگار، داعیِ اسلام حضرت مولانا سید عبداللہ محمد حسنی ندوی

ادارہ اسلامیات

کا

دینی اصلاحی اور صحافتی ترجمان

سہ ماہی

متاعِ کارواں

مشاہیر نمبر

مدیر
مولانا محمد عثمان ندوی

ناشر
ادارہ اسلامیات
عیدگاہ کالونی جگجیونپور ضلع ہریدوار اتراکھنڈ

مشاہیر نمبر

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کیلئے

سہ ماہی

متاعِ کارواں

جلد ۳
شعبان تا ربیع الاول
۱۴۳۸/۳۹ھ

شمارہ ۱۰، ۹
مئی تا دسمبر
۲۰۱۷ء

زرِ تعاون
اس شمارہ کی قیمت: ۱۵۰ / سالانہ: ۱۰۰/روپئے / اعزازی: ۳۰۰۰روپئے

Office Mata-e-karwan
IDARA ISLAMIYAT
Eid Gah Colony, Bhagwanpur - 247661
Distt. Haridwar (U.K.) Mobile: 9927220874
Email:mataekarwan@gmail.com

دفتر سہ ماہی متاعِ کارواں
ادارہ اسلامیات
تحصیل بھگوانپور ضلع ہریدوار اُتراکھنڈ

فہرست مضامین

کالم	کیا	مضمون نگار	کہاں
حرفِ اولیں	حرفِ تشکر	مولانا محمد عثمان ندوی	۴
حرفِ دعا	تحسین وتبریک	حضرت مولانا حکیم سید مکرم حسین سنسار پوری	۵
اداریہ	محرومیوں کا سال	محمد ساجد کھجناوری	۶
حرفِ حقیقت	گنجہائے گرامایہ سے........	مولانا محمد سالم جامعی	۹
مقالات و مضامین	**حضرت مولانا ریاست علی بجنوری**	صفحہ از ۱۳۹ تا ۲۰۰	
	حضرت مولانا ریاست علی بجنوری	حضرت مولانا نسیم اختر شاہ قیصر	۱۳۹
	زندگی کے روشن نقوش	مولانا مفتی محمد عمران اللہ قاسمی	۱۴۳
	مثالی استاذ اور باکمال انسان	مولانا مفتی محمد عفان منصور پوری	۱۵۱

کالم	کیا	مضمون نگار	کہاں
مقالات و مضامین	زندگی کے کچھ انمٹ نقوش	مفتی محمد نوشاد نوری قاسمی	۱۶۴
	گو خاک کی آغوش میں وہ مہر مبیں ہے	مفتی امانت علی قاسمی	۱۸۳
	مقبول جو ہوں شاذ ہیں......	مولانا تبریز عالم حلیمی قاسمی	۱۹۰
منظوم	ریاستِ علم وفن کے تاجدار	مولانا ولی اللہ ولی بستوی	۲۰۱

حرفِ اوّلیں

حرفِ تشکر

محمد عثمان ندوی ☆

الحمدللّٰہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ۔ امابعد

رب کریم کی حمد وثنا میں اس خاکسار کی زبان وقلم کن حروف والفاظ کا سہارا لے، جو بلا استحقاق قدم بہ قدم اپنے عاجز وناتواں بلکہ اطاعت بیزار بندوں پر بھی مہربان رہتا ہے، متاعِ کارواں جس کی یہ خصوصی اشاعت ''**مشاہیر نمبر**'' کی صورت میں نذرِ ناظرین کی جارہی ہے، اپنی مسلسل اشاعت کے دو سال مکمل کر کے تیسرے سال میں داخل ہو چکا ہے۔ یہ اسی قادرِ مطلق کی شان کریمی کا اظہار ہے جس کی بارگاہِ عالی میں اپنے شکستہ دل اور ٹوٹے پھوٹے کلمات کے ذریعہ ''متاعِ کارواں'' کی قبولیت ومعروضیت کی درخواست کے ساتھ اس کے صحافتی سفر کا آغاز کیا گیا تھا، ورنہ تو مادی وسائل اور ظاہری اسباب کل تھے اور نہ آج اس کا دعویٰ۔ لیکن اسی بارِ الٰہ کے نام اور کام کی برکت ہے کہ ہر مرحلہ شوق طے ہونے میں تمام رکاوٹیں کافور ہوتی دکھائی دیں، اربابِ قلم اور اہلِ دانش نے بھی تحریر کے ہر محاذ پر اس کارواں کی پیش رفت میں اپنا بھرپور کردار نبھایا۔۔۔۔۔ورنہ ؎

کہاں میں اور کہاں یہ نکہتِ گل

بہرکیف قرآن نمبر اور پیامِ انسانیت نمبر جیسے ضخیم شماروں کی اشاعت کے بعد ''ادارہ اسلامیات بھگوان پور'' اپنے صحافتی سفر کے تیسرے پڑاؤ پر ''مشاہیر نمبر'' پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔ میں برادرِ مکرم مولانا مفتی محمد ساجد کھجناوری استاذ فقہ وادب جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ کا بھی ممنون ہوں جو ہمارے اس قافلہ کے اہم فرد اور بے لوث محسن ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں اور تمام معاونین اہل قلم کو اپنے شایانِ شان اجرِ جزیل سے نوازے (آمین)۔

☆ مدیر مسئول متاعِ کارواں۔

حرفِ دعا

تحسین وتبریک

عارف باللہ حضرت مولانا حکیم سید محمد مکرم حسین سنسار پوری دامت برکاتہم

خلیفۂ ارشد قطب زماں حضرت مولانا الشاہ عبدالقادر رائے پوریؒ

الحمدللہ العلی العظیم والصلوۃ والسلام علی النبی الکریم ومن تبعھم باحسان الی یوم الدین، امابعد!

برادر عزیز فاضل نوجواں مفتی محمد ساجد کھجناوری سلمہ اللہ تعالیٰ استاذ فقہ وادب جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ کی زبانی یہ معلوم ہو کر بے حد مسرت ہوئی کہ ادارہ اسلامیات بھگوان پور کے زیر اہتمام گذشتہ تین سالوں سے اشاعت پذیر سہ ماہی دینی وعلمی اور فکری مجلہ ''متاع کارواں'' قرآن کریم نمبر اور پیام انسانیت نمبر جیسے ضخیم شماروں کی کامیاب اشاعت کے بعد اب حال ہی میں وفات پانے والے ممتاز اہل علم وقلم پر ''مشاہیر نمبر'' کے نام سے خصوصی اشاعت منظر عام پر لا رہا ہے، جس میں ان اکابر علماء و بزرگان دین کی پاکیزہ حیات و خدمات سے امت اور اس کے جگر گوشوں کو واقف کرانے کا صالح جذبہ کارفرما ہے، یقینا یہ مفید اقدام ہے، اہل اللہ کو یاد رکھنا اور ان کی سیرت کے مفید گوشوں کو اجاگر کرنا احسان شناسی کی بھی دلیل ہے۔ میں مولانا محمد عثمان ندوی اور ان کے رفقاء کو مبارک باد دیتا ہوں، نیز دارین میں اس خصوصی اشاعت کی مقبولیت ونافعیت کے لیے دل سے دعا گو ہوں۔ والسلام

مکرم حسین غفرلہ سنسار پوری

۲۳/۴/۱۴۳۹ھ

محرومیوں کا سال

مفتی محمد ساجد کھجناوری ☆

یہ ہمارے اعمالِ بد اور تکثیر گناہوں کی نحوست ہے یا پھر رب لم یزل ولا یزال کی حکمت بالغہ کا حصہ کہ عالم اسلام اس وقت اپنے نازک ترین دور سے گزر رہا ہے، اس کی ہر صبح و شام خوں آشام سانحات سے عبارت جبکہ ہر منظر اس کے لئے دیدہ عبرت، دنیا کے کسی بھی خطہ پر نظر ڈال لیجئے اس کے ظاہر و باطن کا ذرا چشم وا کر کے مشاہدہ کر لیجئے ہر سطح پر امت مرحوم کی مشکلات دو چند ہیں، توحید کے مستانوں پر یہ زمین اپنی کشادگی کے باوجود تنگ کرنے کی جو شر انگیز مہم شباب پر ہے وہ الگ موضوع ہے، اگر چہ تاریخ کے ادنی طالب علم کیلئے بھی عالم اسلامی کا یہ منظر نامہ کوئی ان ہونی سانحہ نہیں ہے بلکہ ؎

ستیزہ ہائے کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

کے تحت خیر و شر اور ابتلا و آزمائش کا یہ سلسلہ تا ابد بدستور رہے گا، ہر زمان و مکان میں اس کے نام لیوا عسر و یسر اور رنج و فرحت سے شادم کار ہوتے رہیں گے، یہ دیگر ہے کہ زمانہ نبوت سے جیسے جیسے دوری بڑھ رہی ہے وہ رحمتیں اور برکتیں بھی گردش شام وسحر کے ساتھ رخصت پذیر ہیں، ملت کو اس وقت جن دینی و ثقافتی سطحوں پر نا قابل تلافی صدمات درپیش ہیں ان میں اس کے اصحاب علم و کمال، ارباب تقوی وخشیت اور رہبران دین و شریعت کا یکے بعد دیگرے تیزی کے ساتھ اس جہاں فانی سرائے سے اٹھ جانا ہے، کیونکہ اہل علم وفضل کی موجودگی سے اس جہاں کی حقیقی روشنی وابستہ ہے انہیں کے دم نفس سے اہل دنیا کو صحیح فکر وعقیدہ کی تحریک ملتی ہے، اور راست بازی کا عرفان ہوتا ہے علم کی تحصیل سے مومن کا قد نہ صرف دراز ہوتا ہے بلکہ اسکی حقیقی معراج بھی صفت علم وعمل سے آراستہ ہوئے بغیر کار دشوار ہے، کلام ربانی کی تلاوت وتفسیر سے یہ عقیدہ وخیال زیادہ روشن ہو جاتا ہے، باری تعالی نے اہل علم کو اسی لیے حضرات انبیاء علیہم السلام کا وارث حقیقی قرار دیا ہے، ارباب علم وعمل جب تک بقید حیات رہیں گے اس دنیا میں خیر وسلامتی کی باد بہاری چلتی رہیگی، آفتاب ومہتاب کی روشنی، ستاروں کی جگمگاہٹ پھگوں اور پھولوں کی

☆ مدیر تحریر متاع کارواں۔

خوشبو، دریاؤں کی روانی، آبشاروں کی فراوانی اور ضروریات دین و دنیا کی فراہمی اہل دنیا کو سدا بہار رکھے گی بصورت دیگر اس کے بے رونق اور بے نور ہونے کا اعلان کر دیا جائے گا پھر اس کا ایک اسٹیج وہ بھی ہوگا جب حضرت اسرافیل مشیت خداوندی کے عین مطابق صور پھونکیں گے اور کائنات کا ہر ذرہ صور اسرافیل سے دو چار ہوگا، کاروان دین ودانش کی رحلت پذیری محرومیوں کا ایسا عنوان ہے جسے بہرصورت ملت کے لئے اجتماعی خسارہ سے ہی تعبیر کیا جائے گا اس لئے کہ اہل علم کی وفات درحقیقت علم کے سوتوں کا خشک ہوجانا ہے علم کے اٹھا لئے جانے سے جو نقصان ہوگا پیغمبر علیہ السلام نے اس کے خطرات سے اس امت کو آگاہ فرمایا ہے، چنانچہ ایک روایت میں آپ کا ارشاد گرامی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے ''حضرت عبداللہ ابن عمر راوی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالی علم کو یکبارگی نہیں اٹھائے گا کہ اسے لوگوں کے دلوں سے نکال لے بلکہ علم کو علماء کی موت کے ذریعہ اٹھایا جائے گا یہاں تک کہ جب کوئی عالم نہیں رہ جائے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار بنالیں گے چنانچہ ان سے مسائل دریافت ہونگیں تو وہ بدون علم کے فتوی دیں گے اس طرح وہ خود بھی گمراہ ہونگے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے''۔

رسول ہاشمی ﷺ کے مذکورہ ارشاد گرامی کے ذیل میں ہم اپنے اطراف وجوانب کو دیکھیں تو رنج وغم کے بادل منڈلائے ہوئے ہیں، کیونکہ تسبیح کے دانوں کی طرح ہمارے اعیان امت اور علم وکمال کے دھنی بہت تیزی سے بکھر رہے ہیں، رواں سال میں استاذ محترم اور دارالعلوم دیوبند کے محدث شہیر حضرت مولانا نعمت اللہ اعظمی مدظلہ کی زبان سے نکلا یہ جملہ گردش کرتا رہا کہ یہ علماء کی وفات کا سال ہے، اللہ علیم وخبیر ہی جانتے ہیں کہ کس حال میں ان کی زبان سے یہ کلمات ادا ہوئے ہیں، دیکھتے ہی دیکھتے علم وفضل کے کئی عالی شان ستون زمین بوس ہوگئے، اور بساطِ علم وتحقیق سمٹتی نظر آئی۔ منزل فردوس کو سدھارنے والے علم وکمال کے یہ مسند نشیں اپنی اپنی سطح پر ملت اسلامیہ کی دستگیری کرنے کے ساتھ اس کے لئے پشتیبان بنے ہوئے تھے، ان کے ذوق علم وعمل اور اخلاص وروحانیت کی برکت سے امت کو ایمان وعقیدہ کی لذت اور سرشاری محسوس ہوتی تھی، انہیں دیکھ کر آخرت کا استحضار بڑھ جاتا اور یقین ومعرفت کے چراغ روشن رہتے تھے، صراط مستقیم کی وضاحت ان کی زبان فیض رساں ترجمان سے کانوں کو بھلی معلوم ہوتی تھی، بلکہ عمل کے جوت جگانے میں بھی ان مردان حر کی ترغیبات نسخہ کیمیا کا اثر رکھتی تھیں، سفر وحضر خلوت وجلوت اور میدان تحقیق وعمل میں انکے

روشن نقوش و مثالی طرز زندگی سے اپنے ظاہر و باطن کو سنوارنے کا حوصلہ ملتا تھا، اس سلسلۃ الذہب کی کئی کڑیاں ہیں جنکی چمک ٹوٹنے اور بکھرنے کے باوجود علی حالہ باقی ہے، جسے ان کے اخلاص و عمل کی برکت سے موسوم کرنا زیادہ مناسب ہوگا، ان حضرات کے فیوض و برکات کا سیلِ رواں دیکھ کر ہر طالب حق اور علم دوست کی یہی خواہش رہتی کہ ان اکابرامت اور پاسبان دین و شریعت کا ظاہری وجود بھی نگاہوں کے سامنے رہے، تا کہ ان سے استفادہ کے لمحات تا دیر آتے رہیں، اسی لئے یہ حضرات رخصت ہوئے تو آنکھوں میں آنسوؤں کا سمندر انڈیل گئے، ان کے جانے سے اب یہ احساس ہر کسی کو ستا رہا ہے کہ اس پریشان امت مسلمہ کی کیا حالت بنے گی، اور تیز و تند آندھیوں کے رخ پر چراغ مصطفوی کو روشن رکھنے کے ظاہری اسباب کیا ہوں گے؟

دریں باب سوئے آخرت پابہ رکاب ہونے والوں میں بے شمار نام ہیں۔

بقول خواجہ آتش ؎

سامنے سے اُٹھ گئیں ہیں کیسی کیسی صورتیں   روئے کس کس کو اور کس کس کا ماتم کیجئے

سر دست زیر نظر شمارہ ''مشاہیر نمبر'' میں صرف ان چند روشن ضمیر اور پاکیزہ صفت بزرگوں کو عقیدت کا خراج پیش کیا جا رہا ہے جنہیں ملت نے ان کے حین حیات بھی سروں پر بٹھایا اس کے افراد نے ان سے بقدر ظرف استفادہ کیا اور اب بھی وہ ان خاصانِ خدا کے نقوشِ قدم چلنے میں دنیا و آخرت کا نفع محسوس کرتے ہیں۔

''مشاہیر نمبر'' میں شیخ حضرت مولانا محمد یونس جونپوری، حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی بجنوری، حضرت مولانا نسیم احمد غازی مظاہری، امیر شریعت حضرت مولانا مفتی اشرف علی باقوی، حضرت مولانا محمد اسلم قاسمی اور حضرت مولانا مفتی عبداللہ پھول پوری کی حیات و خدمات کو زیبِ داستان بنایا گیا ہے اور ان کے تعارف و خدمات پر تاثراتی مضامین کا یہ ایک آدھا ادھورا مجموعہ ہے جو از راہ سعادت مجلہ متاع کارواں کی ادارتی ٹیم اہل ذوق کی خدمت میں اس احساس کے ساتھ پیش کر رہی کہ ؎

نحب الصالحين ولسنا منهم   لعل اللّٰه يرزقنا صلاحا

اللہ کرے جذبوں کی یہ سوغات اسلاف فراموشی کے حصار سے باہر آنے کی ہمت دے اور احسان شناسی کا ہمارا سرد رویہ تبدیل کرنے میں پیش نظر خصوصی نمبر جرس کارواں کے طور پر دیکھا اور سنا جائے۔

حرفِ حقیقت

۱۴۳۸ھ — گنج ہائے گرانمایہ سے محرومی کا سال

حضرت مولانا محمد سالم جامعی ☆

سن دس نبوی میں جب ایک ہفتہ کے اندر ہی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت و نصرت اور حوصلہ افزائی کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دینے والی دو عظیم شخصیتوں، آپ کے مشفق و مربی چچا ابوطالب اور پھر چند دن بعد آپ پر اپنی جان و مال نچھاور کرنے والی آپ کی ہمساز و دمساز بیوی حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہوا تو اس سال کو اسلامی تاریخ میں ''عام الحزن'' سے تعبیر کیا گیا تھا۔ بلاشبہ کمزوری اور بے کسی کے اس دور میں بیک وقت دو ظاہری سہاروں کا ختم ہو جانا بے حد رنج و ملال کا سبب تھا تاہم اس دورِ نبوت کی فکری و عملی پختگی اطمینان کا ایک ذریعہ تھی جبکہ آج چودہ سو اڑتیس کا سال امت مسلمہ کے فکری، عملی اور دینی زوال کا سال ہے، ایسے میں کسی بھی ایک ایسی شخصیت کا جو علم و عمل میں پختہ ہو اور ایمان و ایقان کی فضاؤں کے وجود میں آنے کا ذریعہ بن رہی ہو، وصال بلاشبہ امتِ مسلمہ کی زبوں حالی کا ایک اشارہ ہی ہو سکتا ہے چہ جائیکہ ایک سال کے اندر عالمی سطح پر نہیں بلکہ محض برصغیر میں درجنوں شخصیتیں ہمیں داغِ مفارقت دے جائیں تو ہمیں یہ کہنا بجا ہی ہوگا کہ ۱۴۳۸ھ امت مسلمہ کے لیے حزن والم کا سال ثابت ہو رہا ہے۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ یہ دنیا کا تقریباً آخری دور ہے اور اسی لیے شاید اس کی رفتار میں بڑی حد تک تیزی آ گئی ہے۔ صبح ہوتی نہیں کہ سورج ڈھلنے کے آثار نظر آنے لگتے ہیں۔ پھر جو دن آتا ہے صدموں کا ذخیرہ لے کر نمودار ہوتا ہے۔ شاید کوئی ہفتہ اور مہینہ ایسا گزرتا ہوگا کہ اصحابِ علم، اربابِ درس و تدریس اور بزرگانِ امت میں سے کسی کے حادثۂ وفات کی خبر نہ آتی ہو۔ سال ۱۴۳۸ھ تو امت مسلمہ کے لیے ایک طرح سے عام الحزن کی حیثیت اختیار کر چکا

☆ایڈیٹر ہفت روزہ الجمعیۃ، دہلی

ہے۔اسی سال کے شروع میں حضرت مولانا عبدالحق اعظمی شیخ الحدیث ثانی دارالعلوم دیوبند کی وفات کے حادثۂ جانکاہ کو برداشت کرنا پڑا تھا، پھر ترانۂ دارالعلوم دیوبند کے خالق اور جمعیۃ علماء ہند کے نائب صدر حضرت مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوری نیز جمعیۃ علماء ہند کے دوسرے نائب صدر حضرت مولانا محمد ازہر رانچوی خلیفۂ مجاز حضرت شیخ الاسلامؒ کی وفات کے صدمہ سے دوچار ہونا پڑا۔ ابھی یہ زخم مندمل بھی نہ ہو پایا تھا کہ جامع الہدیٰ مرادآباد کے شیخ الحدیث حضرت مولانا نسیم احمد غازی بجنوریؒ امت کو روتا بلکتا چھوڑ کر اپنے معبودِ حقیقی کے دربار میں چلے گئے۔ ہمارے پڑوسی ملک پاکستان میں بھی شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خاں صاحبؒ اور مولانا عبدالحفیظ مکی قدس سرہما ملت کو داغِ مفارقت دے گئے۔ ابھی امت اور ہندوپاک کے علمی و دینی حلقے ان پیہم حادثات سے جانبر بھی نہ ہو پائے تھے کہ استاذ المحدثین رئیس العلماء حضرت مولانا محمد یونس صاحب قدس سرہٗ شیخ الحدیث جامعہ مظاہر علوم سہارنپور کے حادثۂ وفات نے پہلے سے ہی شکستہ اور مجروح دلوں کو مزید شکستہ اور مجروح کر ڈالا۔

حضرت الشیخ مولانا عبدالحق اعظمی شیخ الحدیث ثانی دارالعلوم دیوبند اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ اللہ تعالیٰ نے علم و عمل، زہد و تقویٰ، فراستِ ایمانی اور وضعداری و سادگی سے خوب نوازا تھا۔ وہ اعلیٰ درجہ کے واعظ و خطیب تھے حالانکہ ان کا وعظ بالکل سادہ ہوتا مگر چونکہ دل کی آواز ہوتا تھا اس لیے سیدھا دل پر ہی اثرانداز ہوتا تھا۔ حضرتؒ جلالتِ شان، علومِ مرتبت، عظمت و عبقریت اور علم و عمل کا مجسم پیکر تھے۔ جو آپ سے ایک مرتبہ مل لیتا آپ کا گرویدہ ہو جاتا۔ بہت سے دینی مدارس کو آپ کی سرپرستی کا شرف حاصل تھا۔ ۲۰۰۶ء میں جب والدِ محترم نمونۂ اسلاف حضرت مولانا محمد اصغر صاحب نوراللہ مرقدہٗ شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ریڑھی تاجپورہ کی ایماء پر احقر کے چھوٹے بھائی مولانا عبدالخالق صاحب مظاہری نے ''معہدِ اصغر'' ناظر پورہ سہارنپور کے قیام کا ارادہ کیا تو حضرت والد محترمؒ کے حکم پر اس کے سنگ بنیاد کے لیے خصوصیت کے ساتھ حضرت مولانا مرحوم کا انتخاب کیا گیا۔ حضرتؒ کو دعوت دی گئی، تشریف لائے، سنگِ بنیاد کی تقریب میں شرکت کی اور بہ صمیم قلب دعاؤں سے نوازا۔ پھر تاحیات معہد کے جلسوں اور تقریبات میں

سرپرستانہ شرکت فرماتے رہے۔ احقر سے جب بھی کہیں ملاقات ہوجاتی مدرسہ کے بارے میں معلومات فرماتے رہتے تھے۔

غیر مسلموں میں دعوتی کام انتہائی خاموشی کے ساتھ فرماتے۔ آپ کے دستِ حق پرست پر اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد پچاس کے قریب ہے۔ کوئی مشورہ مانگتا بے حد صائب مشورہ دیتے اور اسے امانت سمجھتے۔ مسلسل چونسٹھ برسوں تک بخاری شریف کا درس آپ کی ایسی خصوصیت ہے جس میں شاید آپ کا کوئی شریک وسہیم نہیں ہے۔

یہ ایک تلخ سچائی ہے کہ زندگی کا سفر خواہ کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو ہر ایک کو موت کا ذائقہ چکھنا ہی پڑتا ہے اور آپ بھی زبانِ حال سے یہ کہتے ہوئے اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے:

جان کر من جملہ خاصانِ میخانہ مجھے ۔۔۔ مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

ابھی ۱۶/شوال المکرم ۱۴۳۸ھ کو اپنے وقت کے عظیم محدث اور علم و عمل کے امام، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس صاحب رحمہ اللہ علیہ بھی ہندستان کے علمی و دینی حلقوں کو ویرانی کے حوالے کر کے اپنے پروردگار کے حضور چلے گئے۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس صاحبؒ کی مال ودولت سے بے رغبتی، زہد وقناعت ،آخرت کا استحضار، اتباعِ سنت کا جذبہ واہتمام دیکھ کر گزرے ہوئے علماء، صلحاء اور اتقیاء کے واقعات پر یقین کرنا آسان نظر آنے لگتا تھا۔ انہیں صفات نے ان میں زہد واتقاء اور غیرت وحمیت کی ایک عظیم شان پیدا کر دی تھی۔ ان کی نظر میں امیر وغریب کا کوئی فرق نہیں تھا۔ مجھ جیسا ناکارہ بھی کبھی ملاقات کے لیے چلا جاتا تو بڑی محبت سے پیش آتے۔ بڑے بڑے تجار اور افسران حاضرِ خدمت ہوتے مگر ان کی یہ حاضری محض دعاء ونصیحت تک محدود رہتی تھی۔ آج کے علماء اور داعیانِ دین کے لیے اللہ والوں کی یہ شان بلاشبہ لائقِ تقلید ہے۔ راقم الحروف ایک مرتبہ حاضرِ خدمت تھا۔ ایک بڑے افسر ایک نوجوان عالم کے ہمراہ آئے۔ نوجوان عالم نے ان کا حضرت شیخ رحمہ اللہ سے تعارف کرایا۔ آپ خاموشی کے ساتھ سنتے رہے۔ پھر نوجوان عالم صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا اچھا تشریف لے جائیے اور ان سے کہہ

دیجیے کہ لوگوں سے متعلق جو خدمت ان کے سپرد ہے اسے انصاف کے ساتھ انجام دیں۔ میں نے حضرتؒ کی جوانی کو بھی بچشم خود دیکھا ہے۔ اس وقت بھی خوف وخشیتِ الٰہی کا وہی غلبہ تھا جو آخر وقت تک دیکھا جاتا رہا ہے۔ انتقال کے بعد اہل علم حلقوں کی زبان پر آپ کے لیے امیر المومنین فی الحدیث کا لقب جاری ہے۔ یہ وہی لقب ہے جو قرن اول میں حضرت سفیان ثوریؒ اور حضرت امام بخاریؒ وغیرہم حضرات محدثین کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ تعلق مع اللہ اور خشیت الٰہی کے ساتھ سلوک و طریقت میں بھی اعلیٰ مقام کے حامل تھے۔ علم و عمل کی یہی جامعیت تھی جس نے انھیں ایک امتیازی مقام عطا کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ حضرت مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت الفردوس عطا فرمائے اور امت کو آپ کا نعم البدل سے نوازے۔

اے عشق نہ بل سکیں گے ہم جیسے سر پھرے ۔۔۔ برسوں چراغ لے کے زمانہ اگر پھرے

یہ ایک تاریخی سچائی ہے کہ ہر شخص میں کچھ ایسی خصوصیات ہوتی ہیں جو اسے اس کے معاصرین سے ممتاز کرتی ہیں۔ استاذ الاساتذہ حضرت مولانا ریاست علی ظفر بجنوریؒ کو بھی پروردگارِ عالم نے علم و عمل کے ساتھ سنجیدگی اور متانت سے نوازا تھا۔ ان کا وجود مسندِ تدریس کے لیے ایک زینت تھا۔ وہ سادگی، انکساری اور خاکساری کا نمونہ تھے۔ وہ صرف مدرس ہی نہیں مربی بھی تھے اور استاذ کامل، مزاج شناس بھی۔ انھوں نے اپنے تلامذہ کو تعلیم کے ساتھ ساتھ آدابِ زندگی سے بھی روشناس کرایا۔ تلامذہ کی نفسیات پر ان کی گہری نظر تھی۔ سنگریزوں کے ڈھیر سے گوہر آبدار نکالنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ وہ خاک آلود ہیروں کو تراشنے اور چمکانے کے فن سے خوب واقف تھے۔ مولانا مرحوم کا مطالعہ بڑا وسیع تھا۔ ہر موضوع پر معلومات کا ذخیرہ ان کے دماغ کے کمپیوٹر میں بڑی مقدار میں موجود تھا۔ اس طرح آپ بلند نظری، ذوقِ مطالعہ اور حسن انتخاب کا قطب مینار تھے۔ مولانا مرحوم صاحبِ طرز ادیب کے ساتھ قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ اُردو، عربی اور فارسی زبان میں شعر کہنے پر پوری قدرت تھی۔ دارالعلوم دیوبند کا مشہور ترانہ آپ کی ہی شاہکار تخلیق ہے۔ تصنیف و تالیف اور تربیت کے بھی مردِ میدان تھے۔ 'شوریٰ کی شرعی حیثیت' اور 'ایضاح البخاری'

آپ کی تصنیفات و تالیفات میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ اپنے چھوٹوں کے ساتھ وضع داری اور خورد نوازی کا ان کا اپنا ایک خاص مزاج تھا۔ انتقال سے چند ماہ قبل راقم الحروف کا دیوبند جانا ہوا۔ احقر کو ایک جگہ ملاقات کی غرض سے جانا تھا۔ راستہ حضرتؒ کے دولت کدہ کے سامنے سے گزرتا تھا۔ احقر جیسے ہی دولت کدہ کے دروازے کے سامنے پہنچا مولانا مرحوم دارالعلوم جانے کے لیے دروازہ سے باہر نکلے۔ راقم الحروف کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اصرار کے ساتھ اندر لے گئے اور اپنے صاحبزادے کے ذریعہ اس وقت کی رخصت کی درخواست دفتر تعلیمات کو بھیج دی۔ احقر نے عرض بھی کیا۔ حضرت بس ملاقات ہوگئی ہے، مجھے بھی کہیں جانا ہے۔ آپ بھی درس کے لیے تشریف لے جائیں مگر حضرتؒ نے درخواست مسترد کرتے ہوئے فرمایا بھائی آج تو آپ قابو میں آئے ہیں، اتنی آسانی سے کیسے چھوڑا جاسکتا ہے۔ پھر آپ نے اپنی روایتی خورد نوازی کا بھرپور مظاہرہ فرمایا۔ مولانا مرحوم جمعیۃ علماء ہند کے رکن رکین بلکہ اس کے نائب صدر بھی تھے۔ دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علماء ہند کے تعلق سے خوب باتیں ہوئیں۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد احقر کو اجازت کا پروانہ ملا۔ آج جب حضرتؒ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں اور اپنے اعمالِ حسنہ کا صلہ پانے کے لیے اپنے پاک پروردگار کے جوارِ رحمت میں پہنچ چکے ہیں۔ راقم الحروف کو اس آخری ملاقات کا ایک ایک لمحہ اور حضرتؒ کی گفتگو کا ایک ایک لفظ یاد آرہا ہے اور دل کو تڑپا رہا ہے۔ اب اس ملاقات کی صرف یادیں اور حسرتیں ہی باقی رہ گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ حضرتؒ کو اپنی خصوصی عنایات سے سرفراز فرمائے، آمین۔

ملت اسلامیہ کے لیے غم وحزن کے اس سال نے ایک اور مسندِ تدریس کو بھی ویران کردیا۔ معروف صاحبِ علم وعمل شخصیت حضرت مولانا نسیم احمد غازی بجنوریؒ بھی، جو ایک طویل عرصہ سے مرادآباد کی معروف علمی درسگاہ جامع الہدیٰ میں مشیخت حدیث کے عہدہ پر فائز تھے، اسی عام الحزن میں ہندوستان کے علمی، دینی اور درسی حلقوں کو داغِ مفارقت دے گئے۔ مرحوم کا علم بڑا پختہ تھا۔ درس وتدریس میں کمال حاصل تھا۔ اعلیٰ درجہ کے خطیب ومقرر بھی تھے اور درس میں بھی

اسی کی جھلک نظر آتی تھی۔قوتِ حافظہ خوب تھی۔برموقع تمثیلات سے بات کو طلباء کے ذہن نشین کرانے کے فن میں ماہر تھے۔قادرالکلام شاعر بھی تھے۔برموقع اور برجستہ اشعار سے محفل لوٹنے کا فن بھی خوب جانتے تھے۔مولانا مرحوم اچھا عالمانہ ذوق رکھتے تھے۔وہ ایک کامیاب اور مقبول استاذ ہی نہیں بلکہ استاذ گر بھی کہے جاتے تھے۔ہمیشہ اپنے تلامذہ کو نصائح سے نوازتے جس سے ان کے دلوں میں علم وعمل اور درس وتدریس کی اہمیت،ضرورت اور افادیت جاگزیں ہوجاتی۔تدریسی زندگی کے رہنما اصولوں پر بھی ان کی گہری نظر تھی اور وہ اکثر اپنے رفقائے تدریس اور تلامذہ کو ان پر متوجہ کرتے رہتے تھے۔

اسی سلسلۂ حزن وملال کی ایک کڑی حضرت مولانا محمد ازہر رانچوی قدس سرہٗ کا سانحۂ ارتحال بھی ہے۔مولانا مرحوم نہایت متقی وپرہیزگار شخصیت کے حامل تھے۔جامعہ حسینیہ رانچی کے مہتمم اور جمعیۃ علماء جھارکھنڈ کے عہدۂ صدارت پر فائز تھے۔حضرت فدائے ملتؒ کے دور سے ہی جمعیۃ علماء ہند کے نائب صدر تھے۔شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی قدس سرہٗ سے مجاز بیعت وارشاد تھے۔جھارکھنڈ اور بہار میں ہزاروں متوسلین کا حلقہ موجود ہے جو آج حضرتؒ کی وفات کے بعد احساسِ محرومی میں مبتلا ہے۔خشیتِ الٰہی آپ کا خاص وصف تھا۔حضرتؒ کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے بظاہر اس کا پر ہونا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے ان تمام مرحومین کو ان کی حسنات کے صلہ میں جنت الفردوس کے اعلیٰ درجات سے نواز کر اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ان کی حسنات کو ہمارے لیے بھی ذخیرۂ آخرت فرمائے،آمین۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم   تو نے یہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے

مقالات ومضامین

استاذ مرحوم ومغفور
حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری نوراللہ مرقدہ

مولانا نسیم اختر شاہ قیصر☆

حضرت مولانا ریاست علی صاحب نوراللہ مرقدہ دارالعلوم دیوبند کے مقبول مدرسین میں سے تھے ان کا ایک امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے دورِ آخر کے اکثر بزرگوں کو دیکھا تھا اور وہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ اور امام العصر حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ کے تلمیذِ رشید حضرت مولانا فخرالدین صاحبؒ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کے شاگرد اور ان کی علمی سرگرمیوں کے گواہ اور علمی افادات کے مرتب تھے ''ایضاح البخاری'' کے نام سے حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوریؒ نے اپنے گرامی قدر استاذ کے علمی افادات کو سالہاسال کی محنت کے بعد ترتیب دے کر شائع کیا، ''ایضاح البخاری'' سے حضرت مولانا فخرالدین صاحبؒ کی علمی شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

صحیح تو یاد نہیں شاید ۸۰/ کی دہائی کی بالکل ابتدا میں وہ دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت مدرس عربی تشریف لائے ان کے دارالعلوم دیوبند آنے سے پہلے میں نے انھیں جمعیۃ بک ڈپو، جمعیۃ بلڈنگ گلی قاسم جان دہلی کے دفتر میں دیکھا تھا، جب وہ دارالعلوم تشریف لے آئے تو روز ہی ان کی زیارت ہوتی، کچھ مہینے ان سے متنبی پڑھی، اس کے سوا کوئی اور کتاب پڑھنے کا اتفاق نہ ہوا۔ اس زمانہ میں حضرت مولانا محلہ لال مسجد میں واقع کرایہ کے مکان میں رہتے تھے، جب تک ہم دارالعلوم کے طالب علم رہے شاید ان کے پاس حدیث کی کوئی کتاب نہ تھی، بعد کے سالوں میں انھیں حدیث کی کتابیں ملیں اور بعد کے سالوں کا زمانہ ۳۶/ سال پر مشتمل ہے۔

☆ ، استاذ دارالعلوم وقف دیوبند

حضرت مولانا بڑے ذکی، ذہین، معاملہ فہم، دور اندیش، بصیرت وسوجھ بوجھ کے مالک تھے، اطراف وجوانب پر ان کی نظر رہتی تھی اور ان کے متعلق میں نے پہلے بھی یہ لکھا ہے کم لوگ ہوتے ہیں جو اتنے زود فہم اور معاملات کو جلد سمجھ جانے کا ملکہ رکھتے ہوں، مولانا نے بڑی کامیاب زندگی گزاری، انھیں میں نے بہت بار دیکھا عمِ محترم فخر المحدثین حضرت سید انظر شاہ مسعودیؒ سے ان کی بڑی قربت تھی، وہ حضرت شاہ صاحبؒ کے یہاں نہ صرف یہ کہ رات کی مجلس میں تشریف لاتے بلکہ دیگر اوقات میں بھی ان کی آمد ورفت رہتی حضرت شاہ صاحبؒ ان کی ذہانت وذکاوت کے بڑے قائل تھے اور بہت سے معاملات میں ان پر خوب اعتماد کرتے تھے، ان دونوں حضرات کے تعلقات میں ادب واحترام کے ساتھ بے تکلفی بھی تھی اور کبھی کبھی ہلکے پھلکے طنزیہ جملوں کا بھی تبادلہ ہوتا۔ مگر ان جملوں میں اس کا خیال رکھا جاتا کہ کسی کی دل شکنی اور کردار کشی نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ ایک طوفان سر سے گزر گیا مگر ان دونوں حضرات کے تعلقات میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔ فخر المحدثین حضرت مولانا سید انظر شاہ مسعودیؒ نے جب ''معہد انور'' کے نام سے مدرسہ قائم فرمایا تو چند سال بعد ہی حضرت مولانا ریاست علی صاحبؒ کے صاحبزادے مولانا محمد سعدان مدرس عربی کی حیثیت سے معہد انور میں ملازم ہوئے۔ مولانا سعدان کا ''معہد انور'' سے یہ تعلق حضرت شاہ صاحبؒ اور حضرت مولانا ریاست علی صاحبؒ کے تعلقات کا ایک رخ ہے جس سے ان تعلقات کی گہرائی اور مضبوطی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

حضرت مولانا ریاست علی صاحبؒ اپنے معاصرین میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے اور دار العلوم میں اس وقت اساتذہ کا جو حلقہ موجود ہے اس حلقہ کے اکثر لوگ تو وہ ہیں جو حضرت مولاناؒ کے شاگرد ہیں اور باقی وہ ہیں جو حضرت مولانا سے چند سال پہلے دار العلوم میں آئے اور بہت سے ان کے بعد دار العلوم میں پہنچے۔ اس طرح حضرت مولانا ریاست علیؒ کا شمار دار العلوم کے ان علماء میں بآسانی کیا جاسکتا ہے جنھوں نے حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے دورِ اہتمام کو زمانۂ طالب علمی سے ملازمت کے زمانہ تک قریب سے

دیکھا اور اس کے بعد انھوں نے دو اور دوسرے دور دیکھے۔ کئی سال پہلے حضرت مولانا ریاست علی صاحبؒ نے اپنا ذاتی مکان محلہ خانقاہ میں بنالیا تھا اور وہیں رہائش پذیر تھے، چوں کہ اسی محلہ میں لگ بھگ سو سال سے میرے خاندان کی رہائش ہے اور حضرت امام العصر علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ کی زندگی میں جو مکان تعمیر ہوا تھا اسی مکان میں میرے والد مولانا سید ازہر شاہ قیصر مرحوم رہے اور اب ہم رہتے ہیں۔ اس طرح ایک ہی محلہ میں قیام کی وجہ سے حضرت مولانا سے روز ہی ملاقات ہوتی کبھی مسجد میں جاتے، کبھی مسجد سے نکلتے اور کبھی دارالعلوم کی طرف ان کی آمد ورفت رہتی ۱۳/ سے ۱۴/ سال ہوتے ہیں۔ مسجد خانقاہ میں حضرت مولانا مفتی حبیب الرحمن خیرآبادی نے وعظ وتبلیغ کا سلسلہ قائم فرمایا جس کے ایک فرد حضرت مولانا ریاست علی صاحبؒ بھی بن گئے۔ کسی جمعہ میں حضرت مولانا مفتی حبیب الرحمن کا بیان ہوتا اور کوئی جمعہ ایسا آتا جس میں حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوریؒ تقریر فرماتے۔ مولانا کا مزاج تقریر کا نہ تھا دورانِ تقریر وہ خود بھی اس بات کو کہتے کہ مجھ سے تقریر نہیں آتی وہ تو متولی صاحب کے حکم پر کچھ بات کرنے کے لیے بیٹھ جاتا ہوں حقیقت یہ ہے کہ مولانا اپنی تقریر کو بات کرنے کا جو نام دیتے تھے وہ بالکل صحیح دیتے تھے، کیوں کہ ان کے یہاں سمجھانے کا انداز زیادہ تھا خطیبانہ انداز قطعی نہ تھا، بڑے سلجھے ہوئے انداز میں گفتگو کرتے اور سمجھا سمجھا کر بات آگے بڑھاتے۔

مولانا صاحبِ قلم بھی تھے اور شعری دنیا سے بھی قریبی علاقہ تھا چند کتابیں ان کی موجود ہیں اور مجموعہ کلام ''نغمۂ سحر'' بھی لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ چکا ہے۔ ان کی شاعرانہ عظمتوں اور رفعتوں کا گواہ ''ترانۂ دارالعلوم'' ہے جو انھوں نے لگ بھگ چالیس پہلے کہا تھا، ۱۰/ سے ۱۵/ سال کے عرصے میں میری جتنی کتابیں چھپ کر آئیں وہ سب میں نے ان کی خدمت میں پیش کیں، آخری دو کتابیں ''اعمالِ صالحہ'' اور ''خوشبو جیسے لوگ'' ان کی خدمت میں بھیجیں۔ ۲۴/ اپریل کو ان کتابوں کا اجراء ہوا، ۵/ یا/ ۷/ مئی ۲۰۱۷ء کی بات ہے کتابیں ملنے کے بعد حضرت مولانا کا متصلاً بعد مغرب فون آیا مولانا فرما رہے تھے میں ریاست علی بول

رہا ہوں اوّل مرحلہ میں بات میری سمجھ میں نہیں آئی عرض کیا، کون بول رہے ہیں۔ حضرت نے فرمایا میں آپ کے محلہ سے ریاست علی بول رہا ہوں، عرض کیا حضرت فرمائیے! مولانا نے فرمایا ''خوشبو جیسے لوگ'' میں اظہر صدیقی صاحب مرحوم پر جو مضمون آپ نے لکھا ہے وہ مجھے بہت پسند آیا۔ میں نے دعا کی درخواست کی، اظہر صدیقی مرحوم حضرت مفکر ملت مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ کے داماد تھے اور حضرت مولانا ریاست علی صاحب کے قریبی دوستوں میں ۔ حضرت مولانا ریاست علیؒ سے فون پر جو گفتگو ہوئی یہ آخری گفتگو ثابت ہوئی۔ مئی کے آخری عشرہ میں فجر کی نماز پڑھ کر فارغ ہی ہوا تھا کہ مسجد خانقاہ سے حضرت مولانا کے انتقال کا اعلان ہوا، دوڑتا ہو حضرت کے مکان پر پہنچا تو دیکھا کہ اس دور کا ایک بڑا انسان ہمارے درمیان سے اٹھ گیا ہے اور دار العلوم دیوبند ایک اور علمی نقصان سے دو چار ہو چکا ہے۔ مولانا ریاست علی صاحبؒ نے تدریس کے میدان میں اپنی خاص پہچان بنائی تھی اور ان کی تدریسی خدمت کا زمانہ اچھا خاصا رہا یقین کامل ہے خداوند قدوس ان کی تدریسی خدمات کو قبول فرما کر بلند درجات سے سرفراز فرمائیں گے۔

مقالات ومضامین

حضرت مولانا ریاست علی صاحب کی زندگی کے روشن نقوش

مولانا مفتی عمران اللہ قاسمی ☆

علماء وفضلاء کی مجلس کے میر مگر کبر و بڑے پن سے متنفر، بےلوث محبت کرنے والے ہزاروں افراد کے محبوب، جذبۂ فدائیت سے سرشار بے شمار طلبہ کے منظور نظر مگر ناز محبوب اتراہٹ معشوق سے عاری، میدان علم وتحقیق، حلقہ درس وتدریس میں اعتبار واعتماد کا مقام حاصل کر لینے والے مشہور اساتذۂ فن کے استاذ مگر انکساری وعاجزی کے پیکر، سیاسی گلیاروں میں اہم مناصب پر براجمان قائدین کے مشیر ورہنما مگر زہد واستغناء کا سراپا، متعدد بیماریوں سے نبرد آزما، پیہم عوارض سے دوچار مگر صابر شاکر، مقبول مدرس، عظیم محدث، کامیاب منتظم مگر متواضع وملنسار، شعر وشاعری میں کامل، نظم گوئی میں پختہ، نثر نگاری میں منفرد وممتاز مگر شہرت پسندی اور امتیازی اطوار سے نفرت، نہایت ذکی و دور اندیش مگر حصول منفعت سے ناواقف، رحمدل وہمدرد، شیریں بیاں، زبان پر پیار ومحبت سے لبریز موتی جیسے حسیں الفاظ، جسم پر سادہ لباس، بھیڑ ومجمع سے بچ کر راستہ کے ایک پہلو پر اکیلے چلنے کو ترجیح، شکایتوں کا ازالہ کرنے والے، کسی کو شکایت کا موقع نہ دینے والے، دیکھنے میں ہلکا پھلکا جسم وجثہ مگر ان کے معنوی کمالات وخوبیوں کے آگے کوہ گراں شرمسار۔ اگر مذکورہ اوصاف کا کسی انسانی پیکر میں مشاہدہ ہو تو یقین کر لیجیے کہ وہ ہمارے استاذ حضرت مولانا ریاست علی صاحبؒ کی شخصیت ہوگی، جو دنیا میں بھی محبوب تھے اور یقیناً آخرت میں بھی اللہ تعالی کے محبوب ومقبول بندوں میں ہوں گے۔

تقریباً ۲۶/۲۵ سال پہلے شمالی ہند کے معروف ادارے احقر کی مادر علمی جامعہ عربیہ اعزاز العلوم ویٹ میں پروگرام کی مناسبت سے علماء کرام کی آمد تھی، صغر سنی اور لاشعوری کے باعث احقر کو ان علماء عظام کے ناموں سے واقفیت تھی نہ ہی ان کے علمی مقام اور بلند رتبی کی معرفت، وعظ وخطاب کا سلسلہ جاری تھا کہ اناونسر صاحب نے ایک نئی شخصیت کو خطاب کی

☆ استاذ دار العلوم دیوبند

دعوت دی، سر پر دو پلی ٹوپی، سفید لباس، رفتار و گفتار پر سنجیدگی کا غلبہ، مدعو موصوف کرسی خطابت پر آئے تو علماء حاضرین کی توجہ اور سامعین کے انہماک کے اضافے نے ذات گرامی کی عظمت کا پتہ دیا، تقریر شروع ہوئی، الفاظ کی شیرینی، گفتگو میں ٹھہراؤ، پرلطف انداز، دلچسپ مضمون، ظرافت کی آمیزش اور سامعین کبھی سنجیدہ کبھی مبتسم، بتلایا گیا کہ آنجناب ہمارے اساتذہ کرام کے محبوب استاذ حضرت مولانا ریاست علی صاحب ہیں جو دارالعلوم دیوبند کے استاذ حدیث، ترانہ دارالعلوم "یہ علم وہنر کا گہوارہ" کے تخلیق کار ہیں، اس پہلے تعارف نے مناسبت کا نقش قائم کر دیا۔ پروگرام کے بعد اساتذہ کی مجلس میں حضرت کے حسن انتظام کا ذکر، ظرافت کے واقعات کا محبت بھرا تذکرہ احقر کے دل میں محبت کا رنگ بھرتا رہا، تا آنکہ احقر مادر علمی دارالعلوم میں داخل ہو گیا پھر تو حضرت والا کو قریب سے دیکھنے اور استفادے کے بے شمار مواقع میسر ہوئے، چنانچہ پہلے ہی سال، سال ہفتم میں مقدمہ مشکاۃ شریف، نخبۃ الفکر، اور مشکاۃ شریف جز اول حضرت سے پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، وقت کی پابندی، درس کا نرالا انداز، آسان پیرائے میں مفہوم کی توضیح، ترجمہ کا حسن ان سب پر مستزاد، طلبہ کے ساتھ مشفقانہ برتاؤ، کوتاہی پر لطیف پیرائے میں تنبیہ، جیسے جیسے وقت گزرتا گیا حضرت کی خوبیاں عظمت وعقیدت میں اضافہ کرتی رہیں اور اگلے سال دورہ حدیث میں ابن ماجہ شریف کے درس میں آپ کی علمی شان مزید نمایاں ہو کر نظر آئی۔ احقر اکثر طلبہ میں حضرت والا سے محبت کی جھلک محسوس کرتا جس کی بنا پر عصر بعد کی مجلس کے حاضرین میں شامل ہو گیا، دورہ حدیث تکمیل افتاء، معاونت تدریس کی پوری مدت حضرت والا کی مجلس میں حاضری، خدمت کے مواقع سے سعادت حاصل کرتا رہا۔ جب احقر جامعہ قاسمیہ شاہی مراداباد منتقل ہو گیا تو دیوبند حاضری کے موقع پر حضرت کی محبت وشفقت اور میزبانی سے محظوظ ہونے کا موقع ملتا، پھر جب دارالعلوم دیوبند تقرر ہوا تو پھر سے حضرت والا شفقتوں سے لطف اندوز ہونے اور قریب سے حضرت والا کی خوبیوں کے مشاہدہ کا موقع میسر آیا۔ حضرت کی ذات نوع بہ نوع خوبیوں کی حامل تھی، علمی کمالات فنی مہارت، اخلاقی محاسن کے ساتھ آپ کی بعض خصوصیات ایسی تھیں کہ راہ علم کے ہر راہی کو انھیں اپنانا چاہیئے۔

اصحاب فضل وکمال سے گہری وابستگی اور فضل وکمال کا حصول

درس میں حاضر ہوکر اساتذہ کی تقریر وتشریح کے چند حصوں کا محفوظ رہ جانا، کتابوں کی ورق گردانی کرتے کرتے کچھ اصول وقواعد کا مستحضر ہوجانا ایسی بات ہے جس کا اہل کمال کے یہاں کوئی مقام نہیں ہے، لیکن اہل فضل وکمال کے دامن کو مضبوطی سے تھام کر، ان تھک محنت اور اساتذہ کی توجہات کے طفیل فن میں کمال حاصل کرلینا یقینا قابل تقلید ہے، حضرت کی زندگی میں یہ وصف بہت نمایاں ہے، کہ آپ نے عربی زبان وادب، اردو ادب، اور فن حدیث میں ان فنون کے ماہرین سے گہری وابستگی پیدا کر کے نمایاں مقام حاصل کیا۔

عربی زبان سے گہری مناسبت:

آپ کے تمام شاگرد جانتے ہیں کہ آپ کو عربی زبان وادب سے گہری مناسبت تھی دور طالب علمی میں ہی محنت وشوق کے ساتھ عربی زبان کے حاصل کرنے میں مشغول ہوگئے تھے، اس وقت دارالعلوم میں باضابطہ شعبہ تکمیل ادب کا قیام نہیں ہوا تھا حضرت مولانا وحید الزمان صاحب کیرانوی دارالعلوم میں داخل ہوکر حصول تعلیم میں مصروف تھے اور خود ذاتی طور پر طلبہ کو عربی زبان سکھاتے تھے محنتی اور شوقین طلبہ مولانا کیرانوی سے عربی زبان سیکھتے تھے، حضرت مولانا ریاست علی صاحب بھی مولانا کیرانوی سے وابستہ ہوگئے آپ عربی سیکھنے کی خاطر بہت محنت کرتے تھے، دیواری پرچوں کی تیاری ان کی کتابت وتزئین میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے، ماہ نامہ الازہار کی ادارت آپ سے متعلق رہتی تھی، اپنے ساتھیوں مولانا عبدالجلیل آسامی مولانا لقمان الحق بجنوری کی معیت میں اپنے ہاتھوں سے کتابت کر کے دیواری پرچہ کو آویزاں کرتے، آپ کے ہاتھوں کے تیار کردہ متعدد شمارے آج بھی النادی کے ریکارڈ کی زینت ہیں جو نہایت خوش خط، شستہ تحریر، مختلف رنگ کے قلموں سے ڈیزاین کئے ہوئے ہیں ان کی ہیئت آج بھی بھلی معلوم ہوتی ہے، الازہار رسالے کی پابندی اور بروقت اشاعت میں حضرت والا کی دل چسپی سے خوش ہوکر ایک مرتبہ حضرت مولانا کیرانوی نے تشجیعی کلمات رقم فرمائے جن کو پرچہ میں شائع کیا گیا تھا مولانا کیرانوی کے الفاظ

تھے، **هنيئا لكم يا أغراس دار العلوم هنيئاً۔ لقد قمتم بواجبكم المهم الذى اهمله الجميع حيث تقدمون الى اخوانكم اليوم ازهارا جميلة يسر منظرها وتطيب رائحتها النفوس حقا، لقد كسوتم الحديقة القاسمية رونقا وبهجة، وزدتموها بهاء وحسنا، بارک الله فيما تقومون به وجعلكم موفقين فيما تريدون۔ (الازهار، العدد، الاول۔ ۳/ربيع الاول)** مبارک ہو اے فرزندان دارالعلوم مبارک، یقینا آپ لوگوں نے اپنے اس اہم فریضہ کو ادا کر دیا جس میں باقی ساتھیوں نے سستی برتی، آج تم اپنے بھائیوں کے سامنے خوبصورت پھول پیش کرر ہے ہو، جن کا منظر خوش کن اور ان کی خوشبو دلوں کو بھاتی ہے، حقیقت میں آپ لوگوں نے چمستان قاسمی کو خوش منظری اور پر رونقی کا لباس پہنادیا، اس کے حسن وخوبصورتی کی دوبالا کر دیا اللہ تعالی تمہاری سرگرمیوں میں برکت دے اور تمہارے ارادوں کو کامیاب کرے۔

حضرت الاستاذ کا مختلف فنون کی عربی کتب سے اشتغال، عربی رسائل کا مطالعہ، عربی زبان ادب سے انس رکھنے والوں سے محبت، طلبہ کو عربی زبان کے حصول کی ترغیب اور تدریس کی ابتدا سے انتہا تک عربی ادب کی مختلف کتب کی تدریس آپ کے ذوق عربی کی آئینہ دار ہیں، تکمیل ادب میں داخل نصاب ''البلاغۃ الواضحہ'' تو تقریباً پوری مدت تدریس آپ سے متعلق رہی اور آپ دلجمعی سے اس کو پڑھاتے، جن احباب کو البلاغۃ الواضحہ پڑھنے کا موقع ملا ہو وہ اس کتاب کی دشواری، انوکھے انداز تحریر، مشکل تمرینات، قدیم شعراء کے کلام سے استشہاد، امثلہ کا اصول وقواعد سے انطباق ایسے مشکل امور ہیں جن سے طلبہ جی چراتے ہیں، مگر حضرت والا کا پر کشش انداز، شفقت ومحبت سے لبریز گفتگو، امثلہ کی تفہیم وانطباق، ظرافت کے چھینٹے، ذرا بھی دشواری محسوس نہیں ہونے دیتے تھے اور بہت جلد طلبہ کو فن سے مناسبت ہونے لگتی۔

اردو ادب کا اعلی ذوق:

آپ اردو ادب میں بھی اعلی ذوق کے حامل تھے، دوران درس عربی عبارات کے ترجمہ کیلئے مناسب وبرمحل الفاظ کا استعمال، پرکشش پیرایہ، مجلس یا پروگرام میں مخاطبین کے فہم سے مسئلہ کو قریب کرنے کیلئے معتدل ومتوازن اور مؤثر الفاظ کی تلاش آپ کے اردو ادب

کے ذوق شیریں کا پتہ دیتی، آپ بہت خوبصورت حشو وزوائد سے پاک نثر لکھتے تھے، اسی وجہ سے دارالعلوم کی جانب سے جاری ہونے والی تحریریں، تجاویز وغیرہ کی تیاری کیلئے آپ کی خدمات حاصل کی جاتیں۔ حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے انتقال کے بعد آپ کو شیخ الہند اکیڈمی کا ڈائریکٹر متعین کیا گیا، چنانچہ مضمون نگاری وصحافت میں طلبہ کو فائدہ بہم پہنچانے کے ساتھ اکیڈمی نے ترقی کے مراحل طے کئے، آپ کے زمانے میں متعدد کتابیں منظر عام پر آئیں، اسی طرح رسالہ دارالعلوم دیوبند کی ادارت بھی آپ کے سپرد کی گئی، غرضیکہ شوری کی شرعی حیثیت، رسالہ دارالعلوم کے اداریئے، ایضاح البخاری کی ٹکسالی اور خوبصورت زبان سے ہر کوئی آپ کے اردوادب میں بلند ذوق ہونے کی شہادت دیتا ہے، جس میں آپ کی ذاتی محنت ولگن، کثرت مطالعہ کے ساتھ حضرت مولانا فخر الدین صاحب کی عمدہ بیانی اور کاشف الہاشمی صاحب کی صحبت وتوجہ کا بھی حصہ ہے جس کی بدولت آپ کی زبان میں نکھار پیدا ہوا۔

بلند پایہ شاعری:

اردو شاعری کا بھی آپ کو اچھا ذوق تھا، معیار بلند اور مقبول ترین، آپ کے اشعار میں لطافت فکر وخیال کی بلندی دل کو چھو جانے والی تعبیرات، اور سہل انگیزی بکثرت ملتی ہے، آپ نے اردو کے نامور شعراء مثلاً غالب، مومن، میر، اقبال، اور مجاز لکھنوی کے بعض اشعار کو سامنے رکھ کر ان کے بیان کردہ مضامین کو ان سے عمدہ اور واضح پیرایہ میں کہنے کی کوشش کی، اصحاب فن کے بقول آپ اپنی اس کوشش میں مکمل کامیاب ہیں جس سے آپ کی قدرت شعر گوئی، نیز قدیم شعراء کے کلام پر نظر عمیق کا اندازہ ہوتا ہے، آپ کا مجموعہ کلام ''نغمہ سحر'' کافی پہلے شائع ہوا اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا، اردو اکیڈمی لکھنو کی طرف سے اس پر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ نیز آپکا ترتیب دیا ہوا ترانہ دارالعلوم تو شعری دنیا کا بے مثال ادبی شاہکار ہے جو بحر طویل کے ۱۳۱ اشعار پر مشتمل عقیدت ومحبت کا شاندار نذرانہ ہے، جس میں دارالعلوم دیوبند کی تمام تاریخ کا خلاصہ، مزاج ومنہاج ،موسسین کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے گہری مناسبت، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تاسیسی اشارے، کوہ صفا کی صدائے دعوت، مدینہ منورہ سے رشتہ محبت، حضرت شاہ ولی اللہ سے فکری

مناسبت،تحریک آزادی کی قیادت،حضرت حاجی امداداللہ حاجی عابد حسین صاحب حضرت نانوتوی حضرت گنگوہی حضرت تھانوی حضرت کشمیری ، حضرت شیخ الہند، حضرت مدنی حضرت مولانا فخرالدین صاحب وغیرھم اور سرپرستان، ذمہ داران ،اساتذہ ،مشہور فیض یافتگان کا تذکرہ، ان کی خصوصیات وامتیازات کی طرف لطیف تلمیح ،دارالعلوم کی تعلیمی خصوصیات ،تربیتی امتیازات ،جذبہ عمل جگانے،رازی کی نظر سے استفادہ،رومی کے طرز کواپنانے،نیز معاشرہ کی اصلاح ،دینی روح پروان چڑھانے میں دارالعلوم کردار کو بیان کرنے کے ساتھ شاعر نے ماضی حال مستقبل ہر زمانے سے متعلق ترجمانی کو ایسے حسین پیرایہ میں ڈھالا ہے کہ سننے والا اس کی خدمات، قربانیوں، منصوبوں اوراس کے مزاج سے بخوبی واقف ہوجاتا ہے،ترانہ کیلئے الفاظ کا حسین انتخاب،معانی کی وسعت، برجستگی پھر دارالعلوم کی آفاقیت وطرز اعجاز کی توضیح نے ترانہ کوانفرادیت عطا کردی ہے،بعد کے شعراء کی جانب سے اس ترانہ کی نقل کی بہت کوشش ہوئیں مگر کسی کواس کے جیسا قبول حاصل نہ ہوسکا۔یہ آپ کی شاعری کے بلند معیار ہونے کی دلیل ہے،جس میں مولانا کاشف الھاشمی کی محبت وتربیت کا خصوصی حصہ ہے۔

حدیث شریف سے خصوصی شغف:

آپ کی زندگی کا زیادہ حصہ حدیث شریف کی خدمت میں گذرا،حدیث شریف سے آپ کوخصوصی شغف تھا،علوم کی تکمیل کر کے جس وقت آپ دورہ حدیث کے درس میں شامل ہوئے اس وقت دارالعلوم دیوبند کی مسند حدیث پر حضرت مولانا فخرالدین صاحب جلوہ افروز تھے جن کے درس کی نرالی شان، احادیث کی مبسوط دل نشیں تشریح اور ٹکسالی زبان کے چرچے ہر زبان پر جاری تھے،حضرت مولانا نے ان کے دامن کو مضبوطی سے تھام لیا، اس گہری وابستگی نے استفادے کے مواقع فراہم کئے چنانچہ آپ نے پابندی کے ساتھ حاضر درس ہوکر حضرت شیخ الحدیث علیہ الرحمہ کے درسی افادات کوقلم بند کرنا شروع کیا ،پھر مزید علمی تشنگی دور کرنے اور استفادے کی غرض سے دوسرے سال بھی دورہ حدیث کے اسباق میں شامل ہوئے ،اس مرتبہ بھی افادات کوقلم بند کیا۔فراغت کے بعد بھی حضرت شیخ سے استفادہ کرتے رہے،آپ کوحضرت شیخ

سے عشق کی حد تک تعلق تھا، حضرت کی زندگی میں ہی درسی افادات کو ایضاح البخاری کے نام سے ترتیب دے کر حضرت شیخ کی نظر ثانی کے ساتھ شائع کرنا شروع کر دیا تھا یہ صرف ایک درسی تقریر نہ تھی بلکہ اس میں تمام شروح بخاری کا عطر، اکابر دارالعلوم کی تحقیقات کا نچوڑ، تراجم ابواب پر محققانہ گفتگو، حضرت والا کے ذوق کے مطابق اس انداز سے مرتب کی گئی ہے کہ فن حدیث سے واقفیت رکھنے والے اس کی اعلیٰ شان اور قدر و قیمت کا اعتراف کرتے ہیں۔

بڑوں چھوٹوں ہر ایک کا اعتماد:

زندگی میں انسان کتنا ہی بلند مقام حاصل کر لے مگر حصول اعتماد سے محروم رہ جاتا ہے دوسرے تو کجا بسا اوقات اپنے بھی اس پر اعتماد نہیں کر پاتے مگر حضرت والا کی خوبی کہ آپ کو اپنوں، پرایوں ہر ایک کا خوب اعتماد حاصل ہوا۔ کسی بھی کام کے آپ کے سپرد ہو جانے، آپ سے مشورہ کرنے، آپ کی طرف سے تائید مل جانے پر لوگ مطمئن ہو جاتے تھے، اپنے پھوپا حضرت مولانا سلطان الحق صاحب کا اعتماد، اساتذہ کا اعتماد، خصوصاً حضرت شیخ الحدیث حضرت مولانا فخر الدین صاحب کا اعتماد آپ کے شخصی جوہر اور طبعی سلامتی مزاج کے استحکام کو نمایاں کرتا ہے، جب آپ دارالعلوم دیوبند میں تدریس پر مامور ہوئے تو ذمہ داران اور ارا کین کا اعتماد بھی آپ کو حاصل رہا، دارالعلوم دیوبند کی نشاۃ ثانیہ میں تو آپ انتظامیہ کے دست راست اور فکر وخیال کا اساسی رکن قرار پائے، اس دور کے حالات کا مشاہدہ کرنے والے حضرات آپ کی اس وقت کی خدمات، استقلال واصابت رائے کا وقیع الفاظ میں تذکرہ کرتے ہیں، آپ کو جو ذمہ داری بھی ملی آپ نے اس کے گیسو کو سنوار کر نئی جہت عطا کی۔ معاملات کی شفافیت، نظام کے استحکام کی غرض سے اصول وضع کئے جو بعد کے زمانہ میں معمول بہ قرار پائے، بہت سے اہم امور کو آپ کے مشورے کے بعد ہی عملی شکل دی جاتی۔ اساتذہ وطلبہ کے علاوہ دیگر لوگ بھی اپنے نجی معاملات میں آپ سے مشورہ کر کے اطمینان حاصل کرتے۔

ملی مسائل سے دلچسپی:

عزلت پسندی، کم آمیزی، اسفار سے طبعی نفرت کے باوصف ملی مسائل سے بھی دل چسپی رکھتے، اور سرگرم تنظیموں میں جمعیت علماء ھند کے نظریہ سے اتفاق رکھتے تھے، اپنی جوانی کے ایام میں اس سے وابستہ بھی رہ چکے تھے، دارالعلوم دیوبند میں مصروف تدریس ہونے کے بعد بھی ذمہ داران جمعیۃ سے روابط، اجلاس میں شرکت، اہم امور میں مشورے دیتے رہتے تھے، اخیر عمر میں اس کے رکن عاملہ اور پھر نائب صدر بنا دیئے گئے، اور تا زندگی اپنے تجربات اصابت رائے سے اس عہدہ کو زینت بخشتے رہے۔

آپ اپنی زندگی میں وفاشعار، سخی، فیاض، کمزوروں کے معاون، بے سہاروں کے محسن تھے، کتنے ہی ایسے لوگ تھے، جن کو آپ کے علاوہ گھر کا کوئی فرد نہ جانتا تھا اور آپ کے ذریعہ ان کا تعاون جاری رہتا، تعلقات کو نباہنا، رشتہ داروں اور بڑوں کے تعلقات کو باقی رکھنا آپ کا خصوصی شعار تھا بسا اوقات عصر بعد کی مجلس میں کسی شریک کی عدم سنجیدگی، بداخلاقی کی وجہ سے پراگندگی ہوجاتی، دیگر شرکاء کو ناگواری ہوتی مگر آپ صورت حال کو نباہنے کی کوشش کرتے اور نباہتے رہتے۔

الغرض : ذاتی محنت و لگن، اساتذہ فن سے گہری وابستگی پیدا کر کے فنی مہارت کا حصول، رواداری، اصابت رائے، بڑوں چھوٹوں کے اعتماد کا حصول، حضرت والا کی قابل تقلید صفات ہیں جس وقت انھیں شعور ملا، وہ یتیم ہو چکے تھے، اور جب دنیا سے رخصت ہوئے تو اپنوں پرائیوں کے جم غفیر نے خود کو یتیم محسوس کیا، آپ کو انفرادیت عطا کرنے والا ایسا اتفاق کم ہی انسانوں کے حصہ میں آتا ہے، آپ بلند صفات کے حامل اور اعلی مقام پر فائز تھے، اچھے تھے، اللہ تعالی نے مزید بلند مقام عطا کر کے زیادہ اچھوں میں شامل کرلیا، آپ کی زندگی کے روشن نقوش پسماندگان، عقیدت کیشوں کے لئے خصوصاً اور سبھی کیلئے عموماً قابل تقلید ہیں۔

☆☆☆

مقالات ومضامین

مثالی استاذ اور باکمال انسان

حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری نور اللہ مرقدہ

مولانا مفتی محمد عفان منصور پوری ☆

حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری نور اللہ مرقدہ ہمارے ان شفیق اساتذہ میں سے تھے، جن سے ملاقات بڑی حوصلہ بخش اور ہمت بندھانے والی ہوا کرتی تھی، اسی لیے آپ کی مجالس میں شرکت کا داعیہ برابر رہتا۔ دیوبند قیام کے دوران تو یہ سعادت بکثرت میسر آتی؛ لیکن تدریسی ذمہ داریوں کی وجہ سے جب دیوبند سے دور جانا پڑا تو جب بھی دیوبند آنا ہوتا، آپ کی خدمت میں نیاز مندانہ حاضری کی کوشش کی جاتی۔

ہم کوئی بھی حرکت کرتے یا کسی نئے کام میں ہماری شمولیت ہوتی اور حضرت مولانا کو اس کا علم ہوتا تو آپ سے ملاقات کے وقت انتظار رہتا تھا کہ دیکھیں کیا تبصرہ سننے کو ملتا ہے، قابل اصلاح بات ہوتی تو بڑے لطیف پیرایہ میں اس طرح تنبیہ فرماتے کہ محفل بھی زعفران زار ہو جاتی اور مبتلا بہ کو اپنی غلطی کا احساس بھی ہو جاتا۔ ایک مرتبہ جمعہ کے دن بعد نماز عصر خدمت میں حاضری ہوئی، دیکھتے ہی اپنے مخصوص انداز میں فرمانے لگے: ''آؤ بھائی، آج تو خطبہ میں تم نے ہم لوگوں کو بہت ڈانٹ پلائی، تم نے بھی سوچا ہوگا کہ موقع اچھا ہے، کہہ لو جو کہنا ہے، سب کو خاموشی سے سننا ہی پڑے گا'' مجھے تو اندازہ تھا کہ حضرت ضرور کچھ فرمائیں گے، اس لیے یہ جملے تعجب خیز نہیں تھے؛ بل کہ توقع کے عین مطابق تھے، کیوں کہ حضرت کا کچھ نہ فرمانا خلاف توقع تھا، بہر حال سن کر سر جھکا کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ غلطی کہاں ہوئی، حضرت نے پھر تعریفی کلمات بھی ارشاد فرمائے، بہت حوصلہ افزائی فرمائی اور نصیحت فرمائی کہ بڑوں کی موجودگی میں اس طرح کے مواقع پر خطاب کی ضمیروں اور صیغوں کے بجائے جمع متکلم کے صیغے اور ضمائر کا استعمال مفید اور موثر ہوتا ہے۔

☆ استاذ حدیث جامع مسجد امروہہ۔

بڑائی اور خود پسندی کا بھوت نکالنا آپ بہت اچھی طرح جانتے تھے، ان برائیوں سے خود بھی پاک تھے اور اپنوں کو ان برائیوں میں ملوث بھی دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ مردم شناسی کا ملکہ قدرت نے خوب عطا کیا تھا، ایک نگاہ میں تاڑ لیا کرتے تھے کہ کون کس مقصد سے آیا ہے، کیا کہنا چاہتا ہے اور کس چیز کے لیے تمہید باندھ رہا ہے؟ جانتے سب کچھ تھے، لیکن اپنے آپ کو انجان باور کراتے تھے، زیرکی، عقل مندی، اور فطانت نگاہوں سے ٹپکتی تھی، خاموشی کے ساتھ چہرے پڑھ لیا کرتے تھے، مجلس مشورہ میں بہت کم گو تھے، سب کی سننے کے بعد اخیر میں جس رائے کا اظہار فرماتے وہ سب پر بھاری ہو جاتی اور حاضرین کے لیے اس کو نظر انداز کرنا ممکن نہ ہوتا۔

بڑے خود دار اور فکر و نظر کے پختہ واقع ہوئے تھے، دلائل و شواہد کی بناء پر خلوص نیت کے ساتھ جو نظریہ قائم فرماتے، اس پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہتے اور اپنے فیصلہ پر ایسا اعتماد ہوتا کہ پھر کوئی اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب نہ ہوتا، خودداری کا یہ عالم کہ ابتدائی زندگی بڑی عسرت اور تنگی میں گزری، کتابت کر کے اور چھوٹی موٹی ملازمت کے ذریعہ گزر بسر کرتے رہے، مگر مجال ہے کہ کسی کے سامنے حرف شکایت زبان پر لائے ہوں یا اپنے حالات کا اظہار کیا ہو، سخت سے سخت حالات کا ہنستے مسکراتے مقابلہ کیا اور اپنے وقار و متانت اور سنجیدگی پر آنچ نہ آنے دی۔

آپ بلند کردار کے مالک تھے، معاملہ کی صفائی آپ کا وطیرہ تھا، غصہ کو ضبط کرنا جانتے تھے، کبھی مغلوب الغضب نہیں دیکھا گیا، مخالف ماحول کے دباؤ میں نہیں آتے تھے، مشکل حالات سے نکلنے کی راہ جانتے تھے، ہر شخص کے لیے خیر کا جذبہ اپنے دل میں پنہاں رکھنے والے تھے، بیماروں کی مزاج پرسی اور مرحومین کے اہل خانہ سے تعزیت میں دوسرں پر سبقت لے جانے والے تھے، عشاء کے بعد جلدی سو جانا اور رات کے آخری پہر میں اٹھ کر بارگاہ الٰہی میں راز و نیاز کرنا آپ کی عادات میں شامل تھا، ضعف و پیرانہ سالی کے باوجود باجماعت نمازوں کی پابندی کا حد درجہ اہتمام فرماتے تھے۔

عملیات وظائف میں بھی آپ کو کمال حاصل تھا محض خدمت اور رضاء الٰہی کے جذبہ کے ساتھ اس عمل کو انجام دیتے، آپ کی لکھی ہوئی حروف مقطعات والی چاندی کی انگوٹھی

اور نومولود کے گلے میں ڈالی جانے والی چاندی کی تختی نے بڑی شہرت حاصل کی اور اس کے استعمال سے لوگ برابر فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

خوش خطی میں بھی آپ طاق تھے، موٹے قلم کی کتابت ہو یا باریک، آپ کی تحریر کا توڑ نہیں تھا، عام طور پر باریک سے باریک نب والا قلم استعمال فرماتے اور بغیر لائن والے کاغذ پر بھی سیدھی لائن کے ساتھ اتنا نفیس لکھتے کہ جیسے موتی جڑ دیے گئے ہوں اور کمال یہ کہ بڑے زود نویس تھے، جو لکھتے وہ حرف آخر ہوتا، نظر ثانی میں کانٹ چھانٹ کی ضرورت بہت کم پڑتی تھی۔

باوزن شخصیت:

آپ کی شخصیت علمی، ادبی اور سماجی حلقوں میں بڑی وزن دار اور لائق اعتبار تھی، تواضع اور سادگی کا گرچہ آپ پیکر مجسم تھے، لیکن بزرگوں کے فیض صحبت اور علمی و عملی کمال کے نتیجہ میں سامنے والے پر آپ کا ایسا رعب پڑتا کہ وہ بچھتا چلا جاتا، کسی بڑے سے بڑے ماہر فن یا اپنے میدان کے مہارتھی سے مرعوب و متاثر نہ ہوتے اور نہ ہی کسی پر اپنا رعب جمانے کی کوشش کرتے۔

ہم جب شعبہ افتاء میں زیر تعلیم تھے تو شام کے ایک نوجوان عالم دارالعلوم دیوبند تشریف لائے اور طلبہ میں ان کا بیان بھی ہوا، بہت عالمانہ اور محققانہ گفتگو انھوں نے کی، اہل علم متاثر ہوئے اور معلوم ہوا کہ کئی ہزار احادیث سند و متن کے ساتھ موصوف کو یاد ہیں، جس سے ان کے غیر معمولی قوت حافظہ کا بھی پتہ چلا، شام کو حضرت مولانا کی مجلس میں بھی ان کا تذکرہ رہا، حضرات اساتذہ نے ان کی علمی لیاقت اور خاص طور پر یادداشت کے مثالی ہونے کو بڑا سراہا، حضرت الاستاذ نے بھی ان کی قابلیت کا اعتراف کیا؛ لیکن جو حضرات محض ان کے قوت حفظ سے ضرورت سے زیادہ متاثر تھے، ان سے فرمایا: ”یہ ان کے ذوق کا کمال اور نتیجہ ہے، جس کا جو ذوق ہوتا ہے، وہ اس میدان میں محنت کر کے دوسروں پر فائق ہو جاتا ہے، غالباً ان کے علاقہ میں متن احادیث کو سند کے ساتھ یاد کرانے کا رواج ہوگا ـــــ اور حقیقت بھی یہی تھی، اس زمانہ میں شام میں مرد تو مرد عورتوں میں بھی حفظ احادیث کے

باقاعدہ حلقے قائم تھے ـــــ اسی کے مطابق انھوں نے بھی یاد کرلیا، ہمارے یہاں بھی جن علماء کا جو ذوق اور فن ہے وہ اس میں اپنی مثال آپ ہیں۔''

یہ تھا حضرت کا مزاج، بہت جلدی آپ گہرائی تک پہنچ جاتے تھے، ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ کر اس کی قیمت کا تعین نہیں فرماتے تھے، بڑی سوجھ بوجھ، میانہ روی اور اعتدال کے ساتھ کسی کے بارے میں رائے قائم فرماتے، اس لیے کہ وہ ان اکابر اور جبال علم کی تربیت میں رہ چکے تھے جن کے فضل وکمال، علم وعمل، صلاح وتقوی اور پارسائی وپرہیزگاری کے مقابلہ میں بعد والے تمام تر ممکنہ کمالات کے حامل ہونے کے باوجود کوتاہ قد دکھائی دیتے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند اور اس کے اکابر سے اسی والہانہ اور پرخلوص عقیدت کی وجہ سے کوئی اور ان کی نگاہ میں جچتا نہیں تھا۔

تکلف سے احتراز:

تکلف، تصنع اور بناوٹ سے کوسوں دور تھے، جو بات معلوم نہ ہوتی، اس کا اقرار بہت جلد نہایت واضح الفاظ میں کرتے اور وعدہ کرتے کہ تحقیق کے بعد بتائیں گے، جب بات منقح ہوجاتی تو بڑی وضاحت وبشاشت سے اپنی تحقیقات کے نتائج بتاتے، ضرورت ہوتی تو دوسروں سے پوچھ لینے میں خواہ وہ ان سے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، مطلق تأمل نہ فرماتے۔

ایک مرتبہ احقر نے تصوف کی بعض اصطلاحات کے سلسلے میں حضرت الاستاذ سے استفسار کیا، اولا لاعلمی کا اظہار کیا، پھر غور کرنے کے بعد کچھ سرسری مفہوم بتایا، اس کے بعد دارالعلوم کے کتب خانہ میں موجود ایک فارسی کتاب کی رہنمائی کی کہ اس میں تفصیل مل جائے گی؛ لیکن وہ کتاب بھی دستیاب نہ ہوسکی، درمیان میں معلوم فرماتے رہے کہ مسئلہ حل ہوا یا نہیں، ہفتہ عشرہ کے بعد ایک دن حاضر خدمت ہوا، تو ڈیکس پر رکھی ہوئی ایک پرانی سی کتاب کھولی اور فرمانے لگے کہ اسی دن سے میں جستجو میں تھا، میرے ہی پاس یہ کتاب مل گئی، اس میں تفصیل موجود ہے، پھر ایک ایک اصطلاح کو واضح فرمایا۔ اللہ اکبر

ہجوم کار کے باوجود ایک ادنی سے طالب علم کے معمولی سے سوال کے جواب پر اتنی

توجہ کہ کئی روز گزرنے کے بعد بھی جب تک ڈھونڈھ نہ نکالا، مطمئن نہ ہوئے، اللہ حضرت کی قبر کو منور فرمائے۔ فخر ہے ہمیں حضرت الاستاذ کی ان شفقتوں اور عنایتوں پر۔

کسی مقام پر آپ اپنے لیے کوئی امتیاز نہیں چاہتے تھے، لباس، پوشاک، عادات واطوار، رفتار و گفتار سب سے سادگی جھلکتی تھی، کسی موقع پر چاہنے والے اگر آپ کے اعزاز میں کچھ اہتمام کرتے تو اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ جمادی الاولی ۱۴۳۱ھ جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ میں ایک پروگرام میں ہم لوگوں نے آپ کو مدعو کیا، آپ کی آمد پر اہل مدرسہ بہت شاداں اور فرحاں تھے، عربی درجات کے تقریباً تمام ہی اساتذہ آپ کے شاگردوں میں سے تھے، اور اسی رشتہ کی بناء پر طبیعت کی ناسازگی کے باوجود آپ نے دعوت قبول فرمالی تھی، جب کہ عام طور پر جلسوں میں شرکت سے آپ دور رہا کرتے تھے اور غالباً یہی آپ کا امروہہ کا پہلا اور آخری سفر بھی تھا۔ بہر حال آپ کے اعزاز میں کچھ دور تک سڑک کے دونوں جانب طلبہ کو کھڑا کردیا اور مزاج کو دیکھتے ہوئے یہ تاکید کردی گئی کہ کسی طرح کا کوئی نعرہ نہ لگایا جائے، لیکن جب حضرت گاڑی سے اترے تو چہرے سے انقباض کے آثار ظاہر تھے، اس وقت تو ضبط کیا، کچھ نہیں فرمایا، مہمان خانہ تشریف لے گئے، پھر سمجھایا کہ مجھے معلوم ہے تم لوگوں نے میری محبت اور تعلق میں بچوں کو میرے اعزاز میں کھڑا کردیا، میں اس تعلق کی قدر کرتا ہوں، لیکن سچی بات یہ ہے کہ مجھے یہ چیزیں بالکل پسند نہیں، تم یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ لمبا چوڑا استقبال کریں گے تو ''ریاست'' خوش ہوجائے گا، حالاں کہ ان چیزوں سے میری طبیعت بہت متاثر ہوتی ہے اور دل پر بوجھ ہو جاتا ہے، چلو خیر اب آئندہ اس کا خیال رکھنا۔ اسی طرح کہیں ناظم جلسہ نے اگر آپ کو بلانے میں کچھ مبالغہ سے کام لیا تو اس کی اچھی کلاس لیتے تھے، مزاج میں تعلّی وتفوق نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور نہ دوسروں میں اس کو پسند فرماتے تھے، چھوٹوں میں سے کسی کے انداز سے اگر تعلیکی بو محسوس کرتے تو بہت اچھے طریقے سے اس کو سمجھاتے، اصلاح فرماتے، کسی کی گفتگو اور طرز و انداز سے تفوق مزاجی جھلکتی تو بڑے دل چسپ انداز میں تبصرہ کرنے سے بھی دریغ نہ فرماتے۔

با کمال انسان:

استاذ محترم کی بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ بہت اچھے انسان تھے، ہر طرح کے

لوگوں سے ان کے خوشگوار روابط تھے اور سب کا دل رکھا کرتے تھے، خاموشی کے ساتھ کتنی بیواؤں اور ضرورت مندوں کا وہ ماہانہ تعاون کیا کرتے تھے، اللہ جانتا ہے، صاحبزادگان بتاتے ہیں کہ ایسا بھی ہوا کہ عید کے موقع پر قلت سرمایہ کی وجہ سے اہل خانہ کے لیے کپڑے نہ بن سکے، لیکن جن پریشان حال لوگوں کا تعاون فرماتے تھے، قرض لے کر ان کی ضرورتوں کو پورا کیا اور کسی پر اس کو ظاہر بھی نہ ہونے دیا۔

مولانا محمد یوسف خاں صاحب (ناظم دفتر جمعیۃ علماء ہند) نے تو حضرت مولانا کے حوالے سے عجیب بات ذکر فرمائی جس کو سن کر اندازہ ہوتا ہے کہ خیر خواہی، ہمدردی اور سخاوت کا کیسا عظیم جذبہ تھا جو اللہ نے آپ کو ودیعت فرمایا تھا۔ معاشی اعتبار سے کمزور بعض طلبہ کی آپ کفالت فرمایا کرتے تھے، حالاں کہ ابتداء میں آپ کی زندگی بھی بڑی عسرت میں گزر رہی تھی، طلبہ کے تعاون کا طریقہ کار یہ تھا کہ اگر کوئی شخص تعویذ کیلئے آپکے پاس آتا تو اس سے فرماتے کہ اس پتے پر اتنے روپے منی آرڈر کردو اور اپنی ضرورت لکھ دو، عمل بتا دیا جائے گا، پھر اس طالب علم کو اس عمل سے باخبر کر دیتے، وہ پیسے وصول کرتا اور جواباً عمل ارسال کر دیا کرتا تھا۔

وضعداری اور رواداری تو مانو آپ کی گھٹی میں پڑی تھی، جس سے ایک مرتبہ خلوص کے مراسم ہو گئے تمام عمر کے لیے اس پر مہر لگ گئی، رشتے ناتوں کا پاس ولحاظ اور اہل تعلق سے برابر رابطہ میں رہنا، ان کے دکھ درد میں شریک ہونا، ان کی فرمائشوں کو حتی الامکان قبول کرنا اور ان کی سفارشات پر توجہ دینا اخیر عمر تک آپ کے مشاغل کا حصہ رہا۔ ان چیزوں کا خیال رکھنا بڑی اہم چیز ہے، ورنہ عام طور پر آدمی جب بلندیوں کو چھوتا ہے تو پھر اسے پرانے تعلق دار کہاں یاد رہ جاتے ہیں، وہ تو اپنے معیار کے لیے نئے دوست تلاش لیتا ہے؛ لیکن حضرت مولانا کا کمال یہ تھا کہ انھوں نے پرانے رابطوں کو پرانا نہ ہونے دیا بل کہ اخیر اخیر وقت تک ان کو زندہ رکھا۔

ہمارے گھرانے سے بھی حضرت مولانا کے قدیم مراسم تھے، ہمارے تایا جان حافظ محمد موسی صاحب مرحوم آپ کے ہم مجلس لوگوں میں سے تھے، ان کے سسر جناب عرفان صاحب مرحوم بھی محلہ لال مسجد دیوبند میں آپ کے پڑوس میں رہا کرتے تھے، قریب کے سالوں میں گرچہ ملاقات کا اتفاق کم ہوتا تھا لیکن برابر حال چال دریافت فرماتے تھے، وہ پچھلے کئی سالوں

سے بیمار رہے تو مزاج پرسی کے لیے بھی گئے، تقریبا سات مہینے پہلے انتقال کی خبر ملی تو بیماری اور کمزوری کے باوجود جنازہ میں شرکت کے لیے مظفر نگر تشریف لے گئے۔

حضرت اقدس والد صاحب مدظلہ العالی کی اصول پسندی اور زمانہ طالب علمی سے محسوس کی جانے والی شرافت اور یکسو ہو کر اپنے کام میں اشتغال کا موقع بہ موقع ذکر فرماتے، جس سے آپ کے قلبی لگاؤ اور دلی رجحان کا اندازہ ہوتا تھا۔

ہمیں بھی باضابطہ آپ کی شاگردی اختیار کرنے کا موقع گرچہ اس وقت ملا جب ہم سال ہفتم میں پہنچے اور مشکوۃ شریف اول، نخبۃ الفکر اور مقدمہ شیخ عبدالحق نامی کتابیں آپ کے متعلق درس ہوئیں، لیکن آپ کے گھر آنا جانا اور شفقتوں سے لطف اندوز ہونے کا سلسلہ بہت پرانا ہے، جب کہ آپ محلہ لال مسجد دیوبند میں ایک کرائے کے مکان کے بالائی حصہ میں سکونت پذیر تھے اور نیچے ایک کمرہ میں آپ کی نشست گاہ تھی، جس پر کاشانہ رحمت کا بورڈ لگا ہوا تھا، پھر آپ کا قیام چھتہ مسجد کے قریب واقع دارالعلوم کی عمارت افریقی منزل قدیم میں ہو گیا، یہاں آ کر ایک گونہ پڑوس بھی آپ کا حاصل ہوا، کیوں کہ ہم لوگ بھی چھتہ مسجد سے متصل بالائی حصہ میں رہتے تھے۔ آپ کے چھوٹے صاحبزادہ محترم مولانا سعدان جامی صاحب حفظ کے زمانہ سے ہی ہم درس تھے اور مجھے یاد ہے کہ تکمیل حفظ کے موقع پر ایک تہنیتی نظم بھی حضرت الاستاذ نے تحریر فرمائی تھی جس کو گھر کی ایک مجلس میں مولانا سعدان صاحب نے پڑھا بھی تھا، افسوس کہ اسے مکمل طور پر محفوظ نہ رکھا جا سکا، چند اشعار درج ذیل ہیں:

زمانہ آفریں کہتا ہے عفاں تیری ہمت کو
نہ کیوں ہم داد دیں آخر تری عمدہ ذہانت کو
فلک بھی جھوم جاتا ہے، ملک بھی رقص کرتے ہیں
فرشتے سنتے آتے ہیں تری پیاری تلاوت کو

بے مثال استاذ:

مقدمہ شیخ عبدالحق کی دل نشیں تشریح، نخبۃ الفکر کی پھیلی ہوئی بحثوں کا جامع خلاصہ اور

نچوڑ، مشکوۃ شریف، سنن ابن ماجہ اور سنن ترمذی کی روایات پر پورے گھنٹے بے تکان، مسلسل اور جاندار گفتگو اور پھر تکمیل ادب میں البلاغۃ الواضحہ پڑھانے کا نرالا اور دل چسپ انداز میرے استاذ محترم کا ایسا تھا کہ بھلائے نہیں بھلایا جاسکتا۔

درس گاہ میں پورے سال بلاناغہ اور بروقت حاضری آپ کی مثالی تھی، گھنٹہ بجتے ہی مشکوۃ شریف کی درس گاہ میں تشریف لاتے اور روزانہ حاضری لیتے، نام گزرنے کے بعد اگر کوئی طالب عالم آتا تو اس کی حاضری شمار نہ کی جاتی جس کی غیر حاضری لگ گئی، لگ گئی، اب اس پر قلم نہیں چلے گا۔ ایک بار کسی طالب علم نے رجسٹر میں درج اپنی غیر حاضری کو حاضری بنانے کی کوشش کی، اگلے دن جب حضرت کی نظر اس پر پڑی تو جلال میں آگئے اور ایسے غضبناک ہوئے کہ اس سے پہلے اور اس کے بعد کبھی آپ کو اتنے غصہ میں نہیں دیکھا، فرمایا: ''تمہاری ہمت کیسے ہوئی رجسٹر چھونے کی، آج تم غیر حاضری کو حاضری بنا رہے ہو، کل کسی کے دستخط کی نقل اتاروگے، اپنی خامیوں کو چھپانے کے لیے ناجائز طریقوں کو اختیار کروگے، خبردار اگر آئندہ سے کسی نے رجسٹر کو ہاتھ لگایا تو خیر نہیں ہوگی''۔ خلاف معمول حضرت کی یہ کیفیت دیکھ کر طلبہ تو سہم گئے اور پورے گھنٹہ خاموشی چھائی رہی، درس کے اختتام پر حضرت نے پھر سمجھایا کہ اب قُویٰ پہلے جیسے نہیں رہے، سرد و گرم کو برداشت کرنے کی عادت ختم ہوگئی، شوگر کے مرض کی وجہ سے ناگوار امور کو دیکھ کر غصہ بھی بہت آنے لگا، تم لوگ کیوں ایسی حرکت کرتے ہو، جس سے میری طبیعت متاثر ہو، پھر اس طالب علم کو معاف کیا اور تشریف لے گئے، شروع سال ہی میں غیر حاضری پر آپ کے اس نوٹس کا اثر یہ ہوا کہ پورے سال وقت سے پہلے طلبہ کی حاضری یقینی ہونے لگی اور کسی نے سال بھر رجسٹر پر قلم چلانے کی ہمت نہ کی۔

بہترین مشیر:

معاملہ فہمی اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کے حل میں آپ طاق تھے، آپ کے مشورے بھی بہت موزوں ہوا کرتے تھے، کتنے لوگ ایسے تھے، جو اپنے خانگی، کاروباری اور دیگر مسائل میں بھی حضرت والا کے مشورے پر عمل پیرا ہوتے تھے۔ ایک صاحب کسی علاقہ

میں امام اور مدرسہ میں مدرس تھے، لیکن اس علاقے کے لوگ مولانا صاحب سے مطمئن نہیں تھے اور ان کو برطرف کرنا چاہتے تھے، مگر دشواری یہ تھی کہ دارالعلوم دیوبند کے موقر اساتذہ کے توسط سے موصوف وہاں آئے تھے جس کی وجہ سے کوششیں بارآور نہیں ہو پا رہی تھیں، ذمہ داران حضرت مولانا ریاست علی صاحب مرحوم سے ملے، حالات بتائے، لوگوں کے رجحانات کا ذکر کیا اور پھر اپنی بے بسی بھی بتائی کہ ہم کوششوں کے باوجود ان کو علیحدہ نہیں کر پا رہے ہیں ،آپ مسئلہ کا حل بتائیے حضرت نے فرمایا: یہ کون سا مشکل کام ہے، تمہیں ان سے یا ان کے اساتذہ سے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ، مدرسہ میں ان سے زیادہ قابل کسی آدمی کا تقرر کرلو، سارے مسائل حل ہو جائیں گے، چنانچہ یہی ہوا، ایک دوسرے صاحب کا تقرر کیا گیا، انھوں نے محنت سے کام کیا، نتیجتاً سابقہ مولانا صاحب ازخود وہاں سے تشریف لے گئے۔

ایک مرتبہ دارالعلوم دیوبند میں ایک طالب عالم کا پاسپورٹ چوری ہو گیا، اسے اپنے ساتھی پر شک ہوا اور اس نے پاسپورٹ کی تلاشی میں اس کی الماری کا تالا توڑ دیا، ساتھی نے دارالاقامہ میں شکایت کی اور تالا توڑنے والے پر چوری کا کیس درج ہو گیا، فریقین کے بیانات لے لیے گئے، فائل تیار ہوگئی اور فریق اول کا اخراج تقریبا طے ہو گیا، اس کے والد صاحب نے حضرت مولانا کے سامنے سارے حالات رکھ کر مشورہ طلب کیا، اب کیا کرنا چاہیے، کون سی ایسی صورت اختیار کی جائے جس سے اخراج سے بچا جا سکے۔ حضرت مولانا نے باہم تنازع کرنے والے دونوں طالب علموں کو بلایا اور آپس میں صلح کرادی، پھر اس طالب سے ایک استفتاء لکھوایا، جس میں یہ پوچھا گیا تھا کہ جب فریقین باہم صلح صفائی کرلیں تو کوئی شرعا سزا کا مستحق ہو گیا یا نہیں؟ دارالافتاء دارالعلوم کی طرف سے جواب آیا کہ ایسی شکل میں کسی کو سزا دینے کا شرعاً کوئی جواز نہیں ہے۔ پھر اس فتوی کی بنیاد پر حضرت مولانا نے ذمہ داران دارالاقامہ سے سفارش فرمائی کہ مذکورہ طالب علم کے اخراج کا فیصلہ واپس لے لیا جائے ، کیوں کہ دونوں معاملہ رفع دفع کر چکے ہیں اور دارالعلوم کا فتوی بھی آچکا ہے اور فتوی پر اگر ارباب دارالعلوم ہی عمل نہ کریں گے تو کون کرے گا۔ بہر حال ذمہ داران نے آپ کی سفارش قبول فرمائی اور داخلہ بحال ہو گیا، کوئی قانون شکنی بھی نہ ہوئی اور حسن و

خوبی معاملہ سلجھ گیا۔

ادبی مقام:

شعر وسخن کے باب میں بھی حضرت مولانا کا مقام بہت بلند تھا، ظفر تخلص رکھتے تھے، قدیم اساتذہ کی سوچ وفکر کے حامل تھے، تمام اصناف سخن پر قادر ہونے کے ساتھ ساتھ تغزل اور نعت گوئی میں خاص قدرت رکھتے تھے۔ آپ کا مجموعہ کلام ''نغمہ سحر'' تو محض ایک جھلک ہے، ورنہ فی البدیہ مختلف مواقع کی مناسبت سے آپ نے جو اشعار کہے ہیں، ان کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ ''ترانہ دارالعلوم دیوبند'' اور ''ترانہ جمعیۃ علماء ہند'' اس میدان میں آپ کے عظیم شاہ کار ہیں۔

مولانا محمد یوسف خاں صاحب فرماتے ہیں کہ ''ایک مرتبہ دیوبند میں مولانا محمد عثمان صاحب سابق نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند وچیئرمین نگر پالیکا دیوبند کے مکان میں ایک شعری نشست ہوئی جس میں جگر مرادآبادی بھی تشریف لائے، حضرت مولانا ریاست علی صاحب نے بھی حضرت مولانا عثمان صاحب کاشف الہاشمیؒ کے ساتھ اس پروگرام میں شرکت کی، جگر صاحب نے ایک شعر پڑھا:

تم بھی نہ سن سکوگے صدائے شکست دل
جب خامشی ہی شرط محبت ٹھہر گئی

مولانا محمد عثمان کاشف الہاشمی صاحب نے فرمایا، اس میں مبالغہ کم ہوا ہے، پہلا مصرعہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ:

ہم بھی نہ سن سکیں گے صدائے شکست دل
جب خامشی ہی شرط محبت ٹھہر گئی

حضرت مولانا ریاست علی صاحب نے لقمہ دیتے ہوئے فرمایا، اب بھی مبالغہ پورا نہیں ہوا، پہلا مصرعہ یوں ہونا چاہیے:

دل بھی نہ سن سکے گا صدائے شکست دل
جب خامشی ہی شرط محبت ٹھہر گئی

ادب نوازوں کا مجمع حضرت مولانا کے ذہن کی اس رسائی پر سر دھنتا رہا اور حضرت

جگر کو بھی آپ کی صلاحتیوں کا اعتراف کرتے ہوئے داد دینے پر مجبور ہونا پڑا۔

اردو کی طرح فارسی زبان میں بھی اشعار کہنا آپ کے لیے مشکل نہ تھا حضرت مولانا فخرالحسن صاحب مرادآبادیؒ سابق صدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند کے سفر حج سے واپسی کے موقع پر آپ نے بزبان فارسی ایک منظوم کلام تحریر فرمایا تھا، جس کا آخری شعر یہ تھا:

شوق خواہد کہ دو چشمان ترا بوسہ دہد
اے کہ دردیدہ تر گنبد خضراء داری

شاعرانہ صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ آپ کا نثر بھی بڑا سلیس اور شیریں تھا، خوبصورت ادبی تعبیرات سے مزین جملے آپ کا رواں قلم لکھتا چلا جاتا تھا، علمی موضوعات پر لکھتے تو انداز تحقیقی اور استدلالی ہوتا۔ ''شوریٰ کی شرعی حیثیت'' نامی کتاب میں اس کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے، کسی کا سوانحی خاکہ یا حالات حاضرہ پر تبصرہ مقصود ہوتا تو پھر نثر کا رنگ کچھ اور ہی ہوتا۔ ماہنامہ دارالعلوم کی ادارت کے زمانہ میں آپ کے گہربار قلم سے نکلنے والے اداریے اس کے شاہد ہیں۔

علمی سرمایہ:

حضرت الاستاذ نوراللہ مرقدہ کا تذکرہ ایضاح البخاری کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوگا یہ آپ کی سالہا سال کی محنتوں کا خلاصہ اور نچوڑ اور اپنے استاذ محترم کو بہترین خراج عقیدت ہے۔ بخاری شریف کی یوں تو متعدد اردو شروحات (ناقص ومکمل) بازار میں دستیاب ہیں؛ لیکن موضوع کی جامعیت، تراجم ابواب پر محققانہ کلام، امام بخاریؒ کے رجحان کی وضاحت، کتاب کے کامیاب حل اور مسلک حنفیہ کی تشریح وترجمانی کی حیثیت سے ''ایضاح البخاری'' کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ کتاب کے باوزن اور معتبر ہونے کے لیے صاحب افادات حضرت شیخ فخرالدینؒ سے انتساب ہی کافی ہے۔ پھر سونے پر سہاگے کا کام حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب علیہ الرحمہ نے فرمایا، آپ ایک کہنہ مشق استاذ فن اور ماہر حدیث، پختہ قلم کار اور باذوق انشاء پرداز ہونے کے ساتھ ساتھ حقیقتاً صاحب افادات کے مزاج شناس، ذوق علمی کے

امین و سچے وارث اور ان کے علوم ومعارف کے شارح اور ترجمان ہیں ۔ آپ نے دوسال (۱۳۷۷ھ و۱۳۷۸ھ) حضرت شیخ کے درس بخاری میں شرکت فرما کر افادات کو قلم بند کرنے کا اہتمام فرمایا اور ہزاروں صفحات پر مشتمل گنجینۂ علم سپرد قرطاس کر کے محفوظ کردیا اور طالبان علوم نبوت کو حضرت شیخ کے علوم سے کسب فیض کا موقع فراہم کیا۔ فجز اہ اللہ احسن الجزاء

حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ نے دونوں سالوں کی تقاریر سامنے رکھ کر حضرت شیخ کے زمانے ہی میں ترتیب کا کام شروع کردیا تھا۔ حضرت نے حرفاً حرفاً اصلاح بھی فرمائی، ترتیب و نہج پر خوشی ومسرت کا اظہار بھی کیا اور دعائیں بھی دیں۔ حضرت شیخ کی زندگی میں ۱۳۰۰ (تیرہ سو) صفحات مرتب ہوکر طبع ہو چکے تھے۔

صاحب افادات کی علمی جلالت شان تو اپنی جگہ مسلم ہے ہی لیکن استاذ مرحوم کے حسن سلیقہ، انداز تفہیم اور باب سے متعلق مستند کتابوں سے مواد کی فراہمی نے شروح بخاری کا ایسا نچوڑ پیش کردیا ہے کہ اب ایضاح البخاری کی حیثیت محض درسی افادات کی نہیں بلکہ ایک مکمل اور جامع شرح کی ہوگئی ہے۔

اب تک بفضلہٖ تعالی ایضاح البخاری کی دس جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں، جلد ششم کی ترتیب سے حضرت مولانا محمد فہیم الدین صاحب بجنوری زید علمہ استاذ دارالعلوم دیوبند کی شکل میں آپ کو ایک ایسے جواں سال، ذی علم، باصلاحیت اور قابل قدر رفیق کار مل گئے تھے جنھوں نے نہ صرف حضرت الاستاذ کے متعین کردہ طرز ترتیب وتالیف کو ملحوظ رکھا ہے بلکہ خوب سے خوب تر بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ باری تعالی کی ذات سے امید قوی ہے کہ یہ علمی سلسلہ جاری رہے گا اور جلد پایۂ تکمیل کو پہنچے گا (ان شاءاللہ)

جمعیۃ علماء ہند سے ربط:

حضرت مولانا ریاست علی صاحب کو جمعیۃ علماء ہند سے فکری وابستگی شروع ہی سے رہی، حضرت مولانا سلطان الحق صاحب فاروقیؒ جو آپ کے پھوپھا تھے، پھر خسر بھی بنے اور جن کی سرپرستی میں آپ نے ازاول تا آخر نہایت کامیابی کے ساتھ تعلیمی مراحل اور ترقی کے منازل طے کیے۔ وہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ کے خاص مسترشد اور ان

سے گہرا تعلق رکھنے والے تھے اور اس کا اثر پورے گھرانے پر تھا۔ پھر حضرت مولانا فخر الدین صاحب مراد آبادی علیہ الرحمہ شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند جن سے خصوصی تلمذ کا شرف حضرت الاستاذ کو حاصل رہا، وہ بھی جمعیۃ علماء ہند کے صدر باوقار تھے، اس لیے جمعیۃ علماء ہند کی تحریکات اور سرگرمیوں سے دلچسپی آپ کو برابر رہی اور حسب موقع پروگراموں میں شرکت بھی ہوتی رہی اور اسی تعلق کے نتیجہ میں آپ نے جمعیۃ علماء ہند کا ترانہ بھی تخلیق فرمایا۔

۱۰رمئی ۲۰۰۸ء کو جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کا موقر رکن آپ کو نامزد کیا گیا، پھر اہتمام کے ساتھ آپ مجالس عاملہ میں شرکت بھی فرماتے رہے۔ ۶، ۷ر مارچ ۲۰۱۱ء مسجد عبد النبی میں منعقد ہونے والی مرکزی مجلس منتظمہ میں نیابت صدارت کیلئے آپ کا نام نامی پیش کیا گیا جس کو بالاتفاق منظور کرلیا گیا اور تاحیات جمعیۃ علماء ہند کے نائب صدر کے منصب پر آپ فائز رہے۔

حادثہ فاجعہ:

۱۴۳۸ھ ماہ شعبان کی ۲۳ تاریخ فجر کی نماز سے قبل حضرت الاستاذ کے اچانک سانحہ ارتحال کی خبر سن کر طبیعت پر بڑا اثر ہوا، آپ کا سراپا، خوش اخلاقی، خورد نوازی، ظرافت، کسر نفسی اور محبت بھرا انداز نظروں میں گھوم گیا، وہ بیٹا عفان، بیٹا عفان کہہ کر مخاطب کرنا معمولی معمولی باتوں پر حوصلہ افزائی کے وقیع کلمات ارشاد فرما کر ہم جیسے ناکاروں کی ہمت بندھانا اور ساتھ ہی قابل اصلاح چیزوں پر شفقت بھری تنبیہ کی ایسی یادیں ستانے لگیں کہ دل بے قابو ہوگیا، ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور آنکھوں سے بے ساختہ آنسو بہہ پڑے۔

یہ تصور بے چین کیے دے رہا تھا کہ سفر میں ہونے کے باعث اپنے استاذ محترم کے آخری دیدار سے بھی محرومی رہے گی، رفیق محترم مولانا سعدان جامی صاحب سے ٹیلیفون پر رابطہ ہوا، تعزیت مسنونہ پیش کی، کچھ ڈھارس بندھی اور پھر مسجد نبوی میں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ پاک پر اپنے شفیق و مہربان استاذ گرامی کے لیے دعائے مغفرت کی، اللہ پاک کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائیں اور آپ کی زریں خدمات کا اپنے شایان شان بدلہ مرحمت فرمائیں۔

مقالات ومضامین

حضرت مولانا ریاست علی ظفر بجنوری رحمۃ اللہ علیہ زندگی کے کچھ انمٹ نقوش

مفتی محمد نوشاد نوری قاسمی ☆

بتاریخ ۲۳/شعبان ۱۴۳۸ھ — مطابق ۲۰/مئی ۲۰۱۷ء/بروز ہفتہ حضرت مولانا ریاست علی ظفر بجنوری علیہ الرحمۃ کے انتقال سے، علم وادب، فضل وکمال، صلاح وتقوی، شرافت وذہانت، حاضر جوابی وبیدار مغزی کا وہ روشن مینار ہمیشہ کے لیے ہمارے درمیان سے روپوش ہوگیا، جس سے علم وفن کی عظمتیں قائم، اور عہد رفتہ کی یادیں تازہ تھیں، ان کا سانحۂ وفات، بلاشبہ ایک عہد کا خاتمہ، اور اقدار وروایات، نیز فکر ونظر کی گہرائی وپختگی کے ایک ایسے مضبوط ستون کا انہدام ہے، جس کی تلافی آسان نہیں۔

عربی شاعر عبدہ بن طیب نے کیا خوب کہا ہے:

فما كان قيس هلكه هلك واحد ولكنه بنيان قوم تهدما

ترجمہ: قیس کی ہلاکت ایک فرد کی ہلاکت نہیں؛ بلکہ ایک قوم کی عمارت کا زمیں دوز ہونا ہے۔

اب کسے بتائیں کہ حضرت الاستاذ عہد ساز بھی تھے اور اپنی ذات میں ایک عہد بھی، تاریخ نویس بھی تھے اور خود ایک تاریخ بھی، ان کے جاننے والے جانتے ہیں کہ ان پر کبھی کسی کا علمی رعب قائم ہی نہیں ہوسکا، کہ وہ خود بحر زخار تھے، کمزور اور فاسد افکار ونظریات کا ان کے پاس سے گذر ممکن نہیں تھا کہ وہ فکر اسلامی کے نکتہ شناس جوہری تھے، صاف گوئی سے کوئی مصلحت مانع نہیں ہوتی تھی کہ وہ قلندرانہ مزاج رکھتے تھے۔

ان کی زندگی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے اس لائق ہے کہ پوری تفصیل اور سنجیدگی سے اس

☆ استاذ دارالعلوم وقف دیوبند

کا مطالعہ کیا جائے اور اسے سرمہ ٔچشم بنایا جائے، خوشی کی بات ہے کہ متعدد اہل قلم نے اس فریضہ کو بحسن وخوبی انجام دینے کی کوشش کی ہے، یہ ممکن نہیں کہ ایک مختصر سے مضمون میں، حضرت کی زندگی کا سارا نقشہ کھینچ دیا جائے ؛ تاہم فکر وخیال کی ادنی سی حرکت سے میرے ذہن ودماغ پر، حضرت کی زندگی کے بہت سے نقوش ابھر آئے ہیں، جن کی مختصر فہرست بھی بناؤں تو یہ گوشے لازماً اس کا حصہ ہوں گے :

(۱) بے مثال سادگی (۲) مہمان نوازی

(۳) مشفقانہ مزاج (۴) فکر وخیال کی پختگی

(۵) تحریک دیوبند کی معنویت کا گہرا ادراک

(۶) باطل افکار ونظریات کی تردید میں آپ کا منہج

(۷) با کمال مدرس اور خصوصیات تدریس

(۸) ایک ممتاز محدث اور شارح حدیث

(۹) شعری وادبی خصوصیات

میری خواہش تو یہی تھی کہ میں زندگی کے ایک گوشہ ہی پر بھر پور لکھوں؛ لیکن فارسی کے شاعر نے کیا ہی خوب کہا ہے :

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
تمنا دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست

اس لیے چند نقوش کے سرسری تذکرے سے ہی دل کی تسلی اور حضرت کی روح کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جارہی ہے۔

(۱) بے مثال سادگی:

حضرت انتہائی سادگی پسند، متواضع اور منکسر المزاج تھے، تکلف اور تصنع سے آپ کو طبعی بیر اور تنفر تھا، آپ کی سادگی آپ کے ہر عمل سے نمایاں تھی، لباس پوشاک، انداز بود وباش، گفتگو اور درس سبھی کاموں میں یہ سادگی نظر آتی تھی، لباس آپ کا انتہائی متواضع اور سادہ ہوتا تھا،

چھوٹے دامن کا کرتا، علی گڑھی پاجامہ، اور انتہائی سادہ کپڑے کی دوپلی ٹوپی اور اخیر عمر میں ایک چھوٹی سی چھڑی آپ کی ظاہری ہیئت کذائی کا مکمل آئینہ تھی۔

علم وفن کی دیرینہ شناوری اور غواصی، نیز نکات اور معارف کی ہزاروں داستانیں اپنے سینے میں محفوظ رکھنے کے باوجود کیا مجال تھی کہ علمی خود پسندی کی کوئی بوبھی آپ کی گفتگو اور اندازِ زندگی سے محسوس کی جاتی، وہ درسگاہوں میں بھی بڑی خوب صورتی سے اپنے عجز کا اعتراف کرتے، اور غیر ضروری سوالات پر طرح دے جاتے، بیش تر مسائل میں، اپنی رائے پیش کرنے کے بعد، دوسرے علماء واکابرین سے بھی رجوع ہونے کا مشورہ دیتے، اپنے چھوٹوں کے کاموں کا کھلے دل سے اعتراف کرتے، اور انہیں حوصلہ دیتے، بلکہ بعض دفعہ آگے بڑھ کر مناسب کاموں کا مشورہ دیتے، نہ جانے کتنے علمی کام ہیں جو ان کے مشورہ سے انجام پذیر ہوئے۔

یہ سب ان کی فطری سادگی اور کشادگیٔ قلب ونظر کی دلیل ہے۔

(۲) مہمان نوازی:

دیو بند میں ان کی مہمان نوازی مثالی تھی، ان کے دستر خوان کی وسعت کا ہر کوئی معترف ہے، وہ اس معاملہ میں اپنے ہم عصروں میں بہت ممتاز تھے، دیو بند آنے والے کتنے ہی لوگ ایسے ہوتے جو ان کی نفاست طبع اور ذوق مہمان نوازی کی وجہ سے، پہلے سے ہی طے کر لیتے کہ حضرت کے یہاں قیام اور طعام کرنا ہے، اور وہ بلا تکلف حضرت سے اس خواہش کا اظہار فرماتے اور حضرت خوشی خوشی اسے گوارہ کر لیتے۔

حضرت جیسے مہمان نواز کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ مہمانوں اور ملاقاتیوں کی آمد کا کوئی خاص وقت مقرر کر دیں، ان کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا تھا، اس لیے ان کا علمی مشغلہ بھی کافی متاثر ہوتا؛ لیکن وہ اسے سنت نبوی سمجھ کر انجام دیتے اور ثواب کی نیت رکھتے، ۲۰۰۹ء میں ہم لوگ تکمیل عربی ادب میں داخل تھے، ایک دن درسگاہ سے باہر نکلتے ہوئے راستے میں، ہم کچھ ساتھیوں نے رائے دی کہ ملاقات کا کوئی وقت مختص کر دیا جائے، تو مسکرانے لگے اور فرمایا: طبیعت اس پر آمادہ نہیں ہوتی، بداخلاقی سی معلوم ہوتی ہے۔

(۳) مشفقانہ مزاج:

ان کے مزاج میں عجیب قسم کی شفقت اور خیر خواہی کا عنصر تھا، ان سے مل کر یہ معلوم ہوتا کہ ہم نے اپنے کسی انتہائی خیر خواہ اور مشفق آدمی کو پالیا ہے، درس کے وقت یہ شفقت اور نمایاں ہوجاتی، طلبہ کو بیٹے اور مُنّے سے ہی خطاب کرتے، ہم نے حضرت کا جو زمانہ دیکھا ہے اس میں آپ کی ذمہ داریاں چند گھنٹوں کی تدریس میں منحصر تھیں؛ لیکن سنا ہے کہ جب وہ ناظم تعلیمات جیسے اہم اور ممتاز عہدے پر فائز تھے تو بھی طلبہ کی خیر خواہی، اور شفقت کے ساتھ معاملات کو حل کرنے کا امتیازی انداز رکھتے تھے، ان کے کلام میں بلا کی شیرینی اور لطافت ہوتی، جس سے سننے والا غیر شعوری طور پر، حضرت کے علم وفضل اور اخلاق کا قائل ہوجاتا۔

(۴) فکر وخیال کی پختگی:

پختگیٔ فکر وخیال کے باب وہ ایک انتہائی مستند انسان تھے؛ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ دیوبند میں ایک معیار کا درجہ رکھتے تھے، ان کی باتوں میں شک وتردد کا کوئی عنصر نہیں ہوتا، وہ بڑی صفائی اور حق گوئی کے ساتھ اپنا موقف رکھتے، وہ جہاں بلائے جاتے، چلے جاتے؛ لیکن اپنے موقف میں کوئی لچک نہیں رکھتے، کسی بھی نظریاتی مسئلہ میں ان کی رائے، اعتدال اور صحت کے اعتبار سے حرف آخر کا درجہ رکھتی تھی، اس بات میں کسی کو شک اور تردد ہو تو ہو؛ لیکن حضرت سے عقل وشعور کی بیداری کے ساتھ استفادہ کرنے والے تمام حضرات اس بات پر متفق ہوں گے۔

اس درجہ پختگی کی بظاہر وجہ یہ تھی کہ وہ کوئی بھی نظریہ تقلیداً اختیار نہیں کرتے تھے؛ بلکہ نقلی وعقلی دلائل کی روشنی میں ہی کوئی نظریہ قائم کرتے؛ اس لیے انہیں اپنی بات مدلل کرنے میں کوئی تکلف نہیں ہوتا تھا، وہ برجستہ اپنے نظریات کو اس طرح مدلل کرتے کہ معلوم ہوتا یہ مسئلہ نظری نہیں؛ بلکہ بدیہیات میں سے ہے اور اس میں شک وشبہ پیدا کرنا اپنے عقل وشعور کی بیداری پر سوال اٹھانا ہے۔

اور شاید یہی وجہ ہے کہ انہیں قائل کرنا بھی آسان نہیں تھا، اس لیے کہ وہ نظریاتی مسائل میں، بڑی معروضی نگاہ رکھتے تھے، اور مسائل کے ہر گوشے پر ان کی نگاہ ہوتی تھی، وہ ایک دو

جملوں میں ہی اپنا مدعا پیش کرنے کا ہنر جانتے تھے، بارہا ایسا ہوا کہ جلسوں اور سیمناروں میں شرکاء کی اکثریت کسی ایک رائے پر زور دیتی، آپ اس رائے کے کمزور پہلو کو اجاگر کرتے اور بعد والے تمام لوگ آپ کی تائید میں ہی عافیت محسوس کرتے۔

مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ ۲۰۱۰ء میں، دارالعلوم وقف دیوبند میں، اسلامک فقہ اکیڈمی کا ایک سیمنار ہوا تھا، جس کا موضوع غالباً "مدارس اسلامیہ میں فقہ اسلامی کی تدریس — منہج اور طریقۂ کار" تھا، اس سیمنار کی کسی ایک نشست میں حضرت بھی شریک تھے، اس سیمنار کی تقریبا تمام ہی نشستوں میں شرکاء نے مدارس کے نصاب میں تبدیلی اور علوم جدیدہ کو شامل کرنے کی پرزور وکالت کی تھی، اس نشست میں بھی لوگ اسی دھارا پر بہنے لگے، معاملہ بڑا نازک ہو چکا تھا، آخر میں حضرت کو خطاب کا موقع ملا، حضرت نے فرمایا: "حیرت ہے کہ سیمنار کے موضوع کا مدارس کے نصاب اور علوم جدیدہ کے شامل کرنے سے کیا تعلق ہے؟ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ شرکاء حضرات، فقہ کے منہج تدریس پر اپنے تجربات کی روشنی میں کچھ اظہار خیال فرمائیں گے، یا موضوع سے متعلق کسی مناسب کتاب کے شامل نصاب کرنے کی رائے اور تجویز پیش کریں گے؛ لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہوا ہے، لوگ مجتہدانہ انداز میں اپنی رائے پیش کر رہے ہیں، جس کی اجازت ہر کس و ناکس کو نہیں دی جا سکتی"، الفاظ میرے ہیں؛ لیکن مضمون یہی تھا، بعید نہیں کہ الفاظ بھی ملتے جلتے ہوں، یہ چند سادہ سے جملے تھے، جنہوں نے گم گشتہ خیال لوگوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا، دکھتی رگ پر ایک نباض نے اپنی انگلی رکھ دی تھی، لوگ شرمندگی سے اپنی نظریں چراتے ہوئے نظر آ رہے تھے، اور بعد کے تمام لوگوں کو اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ اصل موضوع پر گفتگو کریں۔

اسی طرح یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ ۲۰۰۶ء میں، دارالعلوم دیوبند میں رابطہ مدارس اسلامیہ کا اجلاس ہو رہا تھا، مرکزی حکومت اس وقت مدارس کی جدید کاری اور اس سے متعلق امور کا منصوبہ بنا رہی تھی، اہل مدارس اور بہی خواہان قوم کی نگاہیں فطری طور پر، دارالعلوم دیوبند پر جمی ہوئی تھیں، کہ یہی امت مسلمہ کی امیدوں کا مرکز، اور خطرناک حالات اور مشکل گھڑی میں امت کی قیادت کا فریضہ انجام دیتا رہا ہے، بہت ہی اہتمام سے اجلاس کا انعقاد ہوا، حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند نے اپنے کلیدی خطبہ میں یہ بات صاف کر دی

تھی کہ مدارس کو بورڈ سے جوڑنے کی حکومتی کوشش، ایک دھوکہ اور مدارس کے نظام میں کھلی مداخلت کا مقدمہ ہے، رابطہ مدارس اسلامیہ کے جنرل سکریٹری حضرت الاستاذ مولانا محمد شوکت علی قاسمی بستوی دامت برکاتہم نے مجھے اس پر مقرر کیا تھا کہ میں حضرات مقررین کی تقاریر کو قلم بند کروں یا کم ازکم خلاصہ ءتقاریر اپنے الفاظ میں لکھ لوں، اس مجلس سے مجھے بھی بہت فائدہ ہوااور دار العلوم کے نظام تعلیم کے مزاج و مذاق کو سمجھنے کا ایک بہترین موقع میسر آیا، میں نے دیکھا کہ حضرات مقررین کے کلام میں تکرار بہت زیادہ ہے، اور اصولی طور پر باتیں دار العلوم کے اصول ہشت گانہ۔ جو خود بانیٔ دار العلوم حضرت الامام محمد قاسم النانوتویؒ کے قلم کا شاہکار ہیں۔ کے ارد گرد گھوم رہی ہیں، شاید سبھی حضرات کے دلوں میں یہ بات آرہی ہوگی کہ اس موضوع پر کوئی ایسی بات بھرپور انداز میں ہوجائے، جو حرف آخر کا درجہ رکھتی ہو۔

شرکائے اجلاس کو یاد ہوگا کہ یہ فریضہ بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی ظفر بجنوری رحمہ اللہ نے انجام دیا، حضرت نے ابن ماجہ شریف کی ایک حدیث کی روشنی میں، اس موضوع پر ایسی تقریر کی، کہ معلوم ہورہا تھا کہ مدرسہ بورڈ ہی کے بارے میں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایات امت کو دی ہیں، سننے والے حضرات عش عش کرنے لگے، انہوں نے اپنی بات بڑے ہی متواضعانہ انداز میں کہی؛ شروع میں ہی کہا: میں تقریر کا آدمی نہیں ہوں، ہاں! میں مامور ہوں، اس لیے بولنا مجبوری ہے، علوم وفنون کے نکات تو آپ ان حضرات کے پاس تلاش کریں جو یہاں تشریف رکھتے ہیں؛ لیکن مجھے تو بس ایک حدیث یاد آرہی ہے، جو اس موقع پر ہماری رہنمائی کرسکتی ہے، پھر وضاحت شروع کی۔

وہ دن ہے اور آج کا دن، اس تقریر کی لذت آج تک محسوس کرتا ہوں، اور دار العلوم کے تعلیمی نظام پر تقلیداً نہیں؛ بلکہ بصیرت کے ساتھ فخر کرتا ہوں۔

(۵) تحریک دیوبند کی معنویت کا گہرا ادراک:

یہ بات لکھنے میں مجھے کوئی تامل نہیں کہ حضرت الاستاذؒ کو تحریک دیوبند کی معنویت، اس کی خصوصیات کا بڑا گہرا ادراک تھا اور وہ اس وصف میں وہ اپنے بہت سے ہم عصروں میں

ممتاز تھے، حضرت مولانا سید ارشد مدنی دامت برکاتہم صدر جمعیۃ علماء ہند واستاذ حدیث دار العلوم دیوبند کا یہ جملہ حضرت الاستاذؒ کی اس انفرادیت کا راز فاش کرتا ہے، مولانا فرماتے ہیں: ''مولانا (ریاست علیؒ) کی طرح دار العلوم کو سمجھنے والا کوئی دوسرا نہیں ہے''۔ (مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری، ماہنامہ دار العلوم دیوبند، اٹھتے جاتے ہیں اب اس بزم سے ارباب نظر، جلد ۱۰۱، شمارہ ۷، جولائی ۲۰۱۷، ص ۳)

انہوں نے تحریک دیوبند کو بڑی باریک بینی سے سمجھ رکھا تھا، اور یہ جوہر انہیں اپنے پھوپھا اور مربی سابق ناظم کتب خانہ دار العلوم دیوبند جناب مولانا سلطان صاحب بجنوری (جو انتہائی ذمہ دار عالم دین، بزرگوں کے صحبت یافتہ اور اپنے وقت میں دار العلوم کے افکار ونظریات کے بے باک نمائندہ تھے) کی صحبت وتربیت سے ملا تھا، انہوں نے حضرت کی علمی اور فکری تربیت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی، اس تربیت اور حضرت کی خداداد صلاحیت وذہانت نے انہیں علمی وفکری میدان کا کامیاب شہسوار بنا دیا تھا۔

اسلام کی تاریخ اصلاح وتجدید، اس کے باعزیمت کرداروں کے احوال، خصوصیات اور پس منظر سے حضرتؒ کی واقفیت بڑی گہری تھی، بالخصوص ہندوستان میں تاریخ دعوت وعزیمت کے محوری قطب حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے اخلاف وتلامذہ کی مجاہدانہ سرفروشیاں اور ان کی علمی، تجدیدی اور اصلاحی خدمات اور کارناموں پر وہ گہری نگاہ رکھتے تھے، شاید اسی وجہ سے تحریک دیوبند، اس کی معنویت وخصوصیات، دیگر تحریکات کے درمیان اس کے امتیاز اور عالم اسلام پر اس کے گہرے اثرات کے باب میں، وہ بہت ہی مستند محقق اور بلند پایہ صاحب نظر تھے۔

بلاشبہ ان کی تصنیفیں بہت زیادہ نہیں ہیں اور نہ انہوں نے خطابت کو بطور ایک فن اپنایا، جس سے ان کے علم وفن اور فکر وخیال کی اشاعت وفروغ کا بہتر سامان مہیا ہوتا؛ لیکن انہوں نے جو کچھ بھی لکھا اور جو کچھ کہا، اس میں تحریک دیوبند اور اس کی خصوصیات کے بیان کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔

اس کی سب سے بڑی دلیل ترانۂ دار العلوم دیو بند ہے، جو نہ صرف ان کی ادبی مہارت اور شعری پختگی کی دلیل ہے؛ بلکہ تحریک دیو بند سے بے پناہ عقیدت ومحبت کا شاہکار اور اس کی تاریخ وکارناموں کو شاندار خراج عقیدت بھی ہے، اور اس باب میں ان کے یہ اشعار، اس بات کے غماز ہیں کہ وہ فکر دیو بند کے عظیم شارح ونمائندہ، علماء دیو بند کے باعزیمت کردار کے امین، اور اس کی تعبیر وتشریح کی غیر معمولی قوت بیان رکھتے تھے۔

جب ذکر ترانۂ دار العلوم کا آ ہی گیا ہے تو یہ بات بھی لکھ دینے میں کوئی حرج نہیں؛ بلکہ موقع کی مناسبت سے ضروری ہے کہ اس حقیر کو ان اکابرین کی تحریروں کے پڑھنے کا بڑا شغف رہا ہے جنہوں نے بالخصوص فکر دیو بند کی تشریح وترجمانی کے میدان میں نمایاں کردار ادا کیا ہے، اور ایسے بزرگان کے نام اور کام سے اہل علم حضرات واقف ہی ہوں گے؛ لیکن یہ بات بڑی ذمہ داری اور احتیاط کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ حضرت مولانا ریاست علی ظفرؒ نے، تاریخ دیو بند اور تحریک دیو بند کی تشریح وترجمانی کے لیے، الفاظ وتعبیرات کو ایک نئی جہت دی، فرسودہ الفاظ اور رسمی تعبیرات سے ہٹ کر ایسے الفاظ اور انداز کو اختیار کیا، جن میں نسیم صبح کی لطافت، خورشید جہان تاب کی حرارت، شاخوں کی لچک، خوشبو کی مہک،، تلوار کی دھار، اور مجاہد کی یلغار کا عکس نظر آتا ہے، ایسا اسلوب جو زندہ اور زندگی بخش ہے، ایسا سحر البیان جو پھول کو شعلہ اور سرو کو مینارہ بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے: ہر پھول یہاں اک شعلہ ہے، ہر سرو یہاں مینارہ ہے۔

فکر دیو بند کی عظمت اور اس کے خوشبو دار کردار کے لیے اس سے بہتر بھلا کیا تعبیر ہو سکتی ہے:

خود ساقئ کوثر نے رکھی، میخانے کی بنیاد یہاں
تاریخ مرتب کرتی ہے، دیوانوں کی روداد یہاں
جو وادئ فاراں سے اٹھی، گونجی ہے وہی تکبیر یہاں
ہستی کے صنم خانوں کے لیے، ہوتا ہے حرم تعمیر یہاں
برسا ہے یہاں وہ ابر کرم، اٹھا ہے جو سوئے یثرب سے
اس وادی کا سارا دامن، سیراب ہے جوئے یثرب سے

کہسار یہاں دب جاتے ہیں، طوفان یہاں رک جاتے ہیں
اس کاخ فقیری کے آگے شاہوں کے محل جھک جاتے ہیں

دار العلوم کے لیے : کاخ فقیری، صحن چمن، بام حرم، بزم ولی اللہی، مجلس مے، اخلاص کا تاج محل، چراغ نعمانی، سایۂ خلد بریں، وادیٔ ایمن، قلزم عرفاں، خورشید دین احمد اور کردار اسلاف جیسی پرشکوہ تعبیریں؛

کردار دار العلوم کے بیان کے لیے : دیوانوں کی روداد، تکبیر وادیٔ فاراں، گل بانگ سحر، اذان آزادی، تنویر نبوت کی ضو، شمع حرم کی پرتو، یعقوب کی لے، عابد کا یقین، قاسمی فطرت، عزم حسین احمد، رومی کی غزل، رازی کی نظر، غزالی کی تلقین، جمال انور، پیمانۂ فخر الدین، یقین کا سوز، ساز معانی کے نغمے، طیبہ کی مے، گیسوئے برہم کو سنوارنا، آواز فطرت، پروانۂ شمع نور، تعلیم کلیم طور اور انوار حرم کی تابانی جیسے انوکھے اور پرشوکت الفاظ؛ صرف ایک شاعرانہ خیال نہیں؛ بلکہ تحریک دیوبند، اس سے وابستہ شخصیات اور اس کے روشن کردار کے بیان کے لیے الہامی الفاظ ہیں، جن میں زندگی ہے، حرارت ہے، حقیقت کی صحیح منظر کشی ہے، شعر وادب کا جادو ہے، دار العلوم کی عظمت کو سلام ہے، دیوبند کے ہر کردار کو شاندار خراج عقیدت ہے، جن میں تصنع نہیں، حقیقت ہے، وہم وخیال نہیں؛ یقین کی روشنی ہے۔

تخیل کی یہ بلند پروازی بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا لکھنے والا غیر معمولی فن کار اور دار العلوم کی عظمت کا خوش نوا حدی خوان اور بلند نگاہ محقق ہے۔

دیکھا گیا ہے کہ بعض دفعہ فکر وخیال کی پختگی کی بنیاد پر انسان کا انداز گفتگو جارحانہ اور غیر شائستہ ہوجاتا ہے، وہ مسالک ومذاہب کے بیان میں انتہائی غیر سنجیدہ اور غلو آمیز باتیں کہتا ہے؛ لیکن علماء دیوبند کا طرۂ امتیاز رہا ہے کہ اس باب میں ان کا دامن افراط وتفریط کے عیوب سے پاک رہا، مولانا ریاست علی ظفرؒ اس وراثت کے امین تھے، افراط وتفریط، غلو اور تعسف سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں رہا، شائستگی ہی ان کی پہچان تھی، شبنمی لطافت ان کے وجود کا عنوان تھی، ان کے شاگردوں کا یہی خیال ہوگا کہ حضرت کو غصہ نہیں آتا؛ لیکن کبھی غصہ آ بھی جاتا تو سخت الفاظ ان کی زبان پر نہیں آتے۔

ایک دفعہ سنن ابن ماجہ کے درس میں، پانچویں گھنٹے میں تشریف لائے، اس دن طلبہ کی تعداد بہت کم تھی، لیکن گھنٹے کے اخیر تک تمام طلبہ حاضر ہو چکے تھے، حضرت کی نرم مزاجی کا طلبہ نے غلط فائدہ اٹھانا شروع کر دیا تھا، حضرت نے ایک دو دن کچھ نہیں کہا؛ لیکن دو دن کے بعد درس کے اخیر میں ایک جملہ فرمایا، جس کی لذت آج تک محسوس کر رہا ہوں، فرمایا: ''بچو! میرا خیال ہے تم پڑھنے ہی آئے ہو، اگر یہی تمہارا بھی خیال ہے تو کل سے وقت پر درس گاہ میں حاضر ہو جانا''، اس جملہ پر تمام طلبہ بہت زیادہ شرمندہ ہوئے اور دیکھا گیا کہ اگلے دن حضرت کی آمد سے قبل ہی درس گاہ طلبہ سے بھر چکی تھی۔

یہی نرم دم گفتگو، ان کا انداز حیات تھی، وہ کسی بھی قیمت پر، مے نوشی کے وہ آداب جو دار العلوم نے ان جیسے تشنہ لبوں کو سکھائے ہیں انہیں کھونا نہیں چاہتے تھے، اسی لیے ادب الاختلاف کی بہت زیادہ رعایت فرماتے تھے۔

(۶) باطل افکار ونظریات کے بارے میں آپ کا موقف:

موقف سے مراد ہے کہ افکار ونظریات کی تردید میں آپ کا منہج کیا تھا؟ یہ بات بڑی نازک ہے، اور مشکل بھی، نازک اس لیے کہ حضرت نے اپنا منہج کہیں لکھا ہی نہیں؛ بلکہ سرے سے انہوں تردید اور تنقید پر باضابطہ کوئی کتاب نہیں لکھی؛ تو اس باب میں جو بھی لکھا جائے گا وہ ان کی مختلف تحریروں اور ان کے مزاج شناس افراد کے بیان سے استنباط کیا جائے گا، اور یہ نازک کام ہے، مشکل اس لیے کہ ہر دور میں افکار ونظریات کی تردید کے لیے مختلف طریقے حالات اور وسائل کے لحاظ سے، اختیار کیے جاتے ہیں، بلکہ ایک دور میں ہی مختلف قسم کے مظاہر اور مناہج سامنے آتے ہیں، ایسے میں کسی کا منہج تردید متعین کرنا اور اس کی خصوصیات کو بیان کرنا ایک دشوار کام ہے۔

تاہم مجھے حضرتؒ کی زندگی کے اس پہلو سے ایک خاص دلچسپی رہی ہے، اس لیے اسے لکھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

بلاشبہ فضلاء دیوبند میں مجموعی طور پر یہ بات قدرے مشترک کے طور پر پائی جاتی ہے کہ باطل افکار ونظریات کو قبول کرنا ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا؛ بلکہ غلط افکار ونظریات کی تردید کو

اپنی ذمہ داریوں کا حصہ سمجھتے ہیں؛ بلکہ تاریخ کی شہادت ہے کہ انہوں نے اس عمل کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے سے بھی گریز نہیں کیا ہے۔

حضرۃ الاستاذؒ نے ترانۂ دارالعلوم میں، اس باب میں دارالعلوم کے صاف ستھرے عمومی مذاق کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے، ان کا ماننا ہے کہ باطل کے لیے یہاں کا ہر پھول شعلہ بن جاتا ہے، اور یہ کہ :

اس بزم جنوں کے دیوانے، ہر راہ سے پہونچے یزداں تک
ہیں عام ہمارے افسانے، دیوار چمن سے زنداں تک

حضرت الاستاذؒ بھی اس وصف میں بہت امتیازی شان رکھتے تھے، وہ تفرد اور تجدد کی راہ پر چلنے والے لوگوں کے افکار ونظریات، کو بڑے سلیقے سے رد فرماتے، جمہور اہل سنت والجماعت کے مسلک اور برصغیر میں اس کے ذوق اعتدال کی حامل ممتاز علمی، اصلاحی وتجدیدی جماعت : جماعت دیوبند کے مسلک پر بڑی مضبوطی سے قائم تھے، غلط افکار ونظریات کی تردید میں ان کا مزاج بہت ہی سادگی لیے ہوئے تھا، وہ ان کی تردید مدلل کرتے؛ لیکن انداز سے ایسا محسوس ہوتا کہ آپ ان افکار ونظریات کو زیادہ اہمیت نہیں دے رہے ہیں، اور باتوں باتوں میں ہی ان کی جڑیں کاٹ ڈالتے۔

"ایضاح البخاری" — جو اردو زبان میں بخاری شریف کی انتہاری معیاری شرح ہے — میں اس کے بہت سے نمونے پائے جاتے ہیں، ایک دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں:

قبروں پر پھول چڑھانا:

بریلوی حضرات اور ان کے ہم مزاج اہل بدعت نے جہاں بہت سی بدعات ایجاد کی ہیں یا ان کی وکالت کی ہے، ان میں ایک بدعت قبروں پر پھول چڑھانا بھی ہے، خوش قسمتی سے انہیں ایک حدیث مل گئی، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو قبروں پر کھجور کی ٹہنی ڈالی تھی، اس امید سے کہ سوکھنے سے قبل تک صاحب قبر کو عذاب میں تخفیف ہوگی، اس حدیث کو امام بخاریؒ نے "**باب من الکبائر ان لا یستتر من بولہ**" کے تحت نقل کیا ہے، اس حدیث کی وضاحت

کرتے ہوئے حضرت الاستاذ نے بغیر نام لیے ہوئے بڑے مدلل انداز میں اہل بدعت کی تردید کی ہے۔

حضرت لکھتے ہیں : ''اب یہ بات رہ جاتی ہے کہ قبروں پر سبزہ لگانے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟اس حدیث میں آیا ہے کہ سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شاخ کے دو ٹکڑے فرمائے اور دونوں کو الگ الگ رکھ دو قبروں پر رکھ دیا اور فرمایا :**لعلہ ان یخفف عنھما ما لم تیبسا**، اگر اس کا ترجمہ یہ کیا جائے کہ ان ٹہنیوں کے خشک ہونے سے قبل ان دونوں کے عذاب میں تخفیف ہوجائے گی،تو یہ ارشاد قبروں پر سبزہ لگانے کے موضوع سے متعلق نہیں رہتا، اور اگر ترجمہ وہ کریں جو عام طور پر علماء کررہے ہیں کہ جب تک یہ شاخیں سبز رہیں گی، اس وقت تک عذاب میں تخفیف رہے گی،تو یہ ارشاد عذاب قبر کی تخفیف اور قبروں پر سبزہ لگانے کے سلسلے میں موضوع بحث بنتا ہے۔

آگے چل کر اس سلسلے میں دو فریق ہوگئے ہیں :ایک فریق قبروں پر سبزہ لگانے یا پھول ڈالنے کے سلسلے میں اس ارشاد کو اصل بنائے ہوئے ہے، یہ حضرات کہتے ہیں کہ آپ نے سبز ٹہنیوں کو لگا کر یہ ارشاد اس لیے فرمایا ہے کہ سبز شاخیں تسبیح خداوندی کرتی ہیں، اور ان کی تسلیم کی برکت سے عذاب میں تخفیف کی توقع ہوجاتی ہے، جب سبز درخت کی تسبیح کا یہ اثر ہے تو مقبورین کے ساتھ رحمت وشفقت کا تقاضا ہے کہ ہم وہ عمل کریں جس سے ان کے عذاب میں کمی یا اس کے ختم ہوجانے کی توقع ہو، چنانچہ ان حضرات نے قبروں پر سبزہ لگانے کے سلسلے میں مختلف عمل گھڑ لیے ہیں''۔

پھر آپ نے اس مسئلہ میں اہل حق علماء کا مسلک مدلل نقل کرنے کے بعد ایک اہم نکتہ کی طرف اشارہ فرمایا، لکھتے ہیں : ''آگے یہ بات کہ یہ ان درختوں کی تسبیح کا اثر ہے یا اس سلسلے میں حدیث ساکت ہے،ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ درخت کی تسبیح سے کہیں زیادہ تو آپ کے دست اقدس کی برکت ہے،جس سے آپ نے شاخ کو چیرا ہے، اور اس کو قبر پر رکھنے یا گاڑنے کا عمل بھی فرمایا ہے، ذرا آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمومی شفقت اور آپ کی سفارش کا درخت کی تسبیح

سے موازنہ کیجیے، کون کہہ سکتا ہے کہ ان دونوں میں کچھ بھی نسبت ہے''؟ (مولانا ریاست علی ظفر، **ایضاح البخاری**، ج۲، ص۲۶۶ :— ۲۶۷)

اس کلام میں نہ صرف اہل بدعت کی تردید کی گئی؛ بلکہ ان کے دعویٔ عشق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت بھی اجاگر کردی گئی، کہ وہ تخفیف عذاب کے عمل کو دست نبوی کی طرف منسوب کرنے کے بجائے، ایک بے حقیقت لکڑی کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور اس پر عاشق رسول ہونے کا

دم بھرتے ہیں، اس طرح اپنے مزاج کے مطابق بڑے ہی شیریں انداز میں، رد بدعت بھی کرگئے اور اہل بدعت کو آئینہ بھی دکھا گئے، اور خاص بات یہ ہے کہ کسی کا نام لیے بغیر مسئلہ کی پوری حقیقت واضح کردی۔

رفع یدین کے مسئلہ کا خلاصہ :

نماز میں رکوع میں جاتے ہوئے، رکوع سے اٹھتے ہوئے، اسی طرح سجدے میں جاتے اور اٹھتے ہوئے ہاتھوں کو تکبیر تحریمہ کی طرح اٹھانا ان مسائل میں ہے، جن میں کچھ حضرات نے اپنی دلچسپی اس قدر بڑھالی ہے کہ انہیں ایمان وکفر کا معیار قرار دے رکھا ہے، وہ کسی بھی حال میں، اختلاف عمل کو گوارہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، شاید اسی لیے علماء دیوبند کو اپنے موقف کی وضاحت کرنے کے لیے، ان مسائل کی حقیقت اور شریعت اسلامیہ کے صحیح موقف کی توضیح کی ضرورت پڑی، حضرت الاستاذؒ نے ایضاح البخاری میں اس مسئلہ پر تقریباً ساٹھ صفحات لکھے ہیں، اور مسئلہ کی معروضی انداز میں تحقیق پیش کی ہے، اور فریقین کے دلائل کا سنجیدگی سے جائزہ لیا ہے، نیز علماء دیوبند کے حقیقی ذوق کی بھی شاندار نمائندگی کی ہے، مسئلہ کی نوعیت واضح کرتے ہوئے حضرت رقم طراز ہیں :

''حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ میں دونوں فریق کے راہ اعتدال سے تجاوز کر کے مناظرانہ انداز اختیار کرنے کے سبب، یہ مسئلہ اہمیت اختیار کر گیا، پھر عصر حاضر کی ادب واحترام سے محروم ایک جماعت کی جارحیت کے سبب، ہندوستان میں اس مسئلہ کو مزید اہمیت حاصل ہوگئی، ورنہ ائمہ

مجتہدین کے درمیان تو اس مسئلہ میں اختلاف محض اولی وغیر اولی یا افضل ومفضول کا ہے، جن ائمہ نے رفع یدین کو راجح قرار دیا ہے، ان کے یہاں ترک رفع بھی جائز ہے، اور جن ائمہ کا مسلک مختار ترک رفع ہے، ان کے یہاں رفع یدین بھی مباح ہے، حضرت گنگوہیؒ سے اس مسئلہ میں سوال کیا گیا تو تحریر فرمایا : میرا مسلک ترک رفع کا ہے، جیسا کہ قدماء حنفیہ نے فرمایا ہے، اور طعن بندے کے نزدیک کسی پر روا نہیں کہ مسئلہ مختلف فیہا ہے، اور احادیث دونوں طرف موجود ہیں، اور عمل صحابہ بھی، اور قوت وضعف مختلف ہوتے ہیں، بالآخر دونوں معمول بہا ہیں (فتاوی رشیدیہ، ص ۲۶۴)، حضرت گنگوہیؒ کی تحریر سے اکابر دیوبند کا ذوق معلوم ہو گیا کہ یہ متقدمین کے شدت پسند طبقہ سے دور تر ہیں اور ان میں سے اعتدال پسند طبقے کے رجحانات کے حامل ہیں، جیسے چوتھی صدی کے مشہور مفسر اور حنفی فقیہ امام ابوبکر جصاص (المتوفی سن ۳۷۰ھ) نے احکام القرآن میں کتب علیکم الصیام کے تحت رویۃ ہلال پر بحث کرتے ہوئے یہ اصول بیان کیا ہے کہ عوامی ضرورت اور فرض درجہ کے احکام کے ثبوت کے لیے خبر مستفیض کی ضرورت ہے اور اگر مسئلہ مسلمانوں کی عام ضرورت سے متعلق نہ ہو اور حکم بھی فرض کے درجے میں نہ ہو تو وہاں خبر مستفیض پر انحصار نہیں، اخبار آحاد سے بھی یہ احکام ثابت ہو سکتے ہیں اور ایسے مسائل میں فقہاء کے درمیان اختلاف عموما افضل وغیر افضل کا ہوتا ہے، پھر انہوں نے اس کی مثال میں کلمات اذان واقامت میں اختلاف، رکوع میں جاتے وقت رفع یدین، تکبیرات عیدین وغیرہ کا شمار کیا ہے (احکام القرآن، ج۱، ص ۲۰۳، ۲۰۴)، معلوم ہوا کہ فقہاء شافعیہ میں جن لوگوں نے ترک رفع پر فساد یا فقہاء احناف میں جن لوگوں نے رفع یدین پر کراہت کی کوئی بات کہی ہے وہ بیجا تشدد پر مبنی ہے اور اکابر دیوبند کے ذوق اعتدال کے منافی ہے"۔ (ایضاح البخاری، ج۴، ص ۳۲۴)

اس مسئلہ کی اتنی معتدل اور انصاف پسند تشریح سب کے بس کی بات نہیں؛ یہ خاص علماء دیوبند کا مزاج ہے، جنہوں نے ادب الاختلاف اور اسکے اصولوں کی غیر معمولی رعایت کی ہے۔

اس کے بعد حضرت الاستاذؒ نے بڑی تفصیل سے اس مسئلہ کی وضاحت کی، اخیر میں رقم

طراز ہیں: ''مسئلہ بذات خود اہمیت کا حامل نہیں، اولی غیر اولی کا اختلاف ہے؛ لیکن مناظرانہ انداز گفتگو نے اس کی اہمیت میں اضافہ کر دیا، اس لیے پہلے فریقین کے دلائل کا منصفانہ جائزہ لیا گیا، پھر مسئلہ کی تنقیح کے لیے تاریخی شواہد پیش کیے گئے، خلاصہ یہ ہے کہ احادیث دونوں طرف ہیں، امام بخاریؒ نے رفع یدین کو ترجیح دی ہے، اور اس مسئلہ کے لیے دو روایتیں پیش کی ہیں؛ لیکن ان دونوں روایتوں سے کسی بھی طرح رفع یدین کا سنت مستمرہ ہونا یا آخری عمل ہونا ثابت نہیں، اس لیے یہ کہنا پڑتا ہے کہ محدثین یا ان کے اصول کے مطابق فیصلہ کرنے والے حضرت ابن عمرؓ کی روایت میں پائی جانے والی سند کی ظاہری قوت سے متاثر ہو کر رفع یدین کا سرسری اور سطحی فیصلہ کر گئے اور انہوں نے ترجیح پر استدلال سے پہلے مندرجہ بالا حقیقت اور روایت میں پائے جانے والے طرح طرح کے اضطراب واختلاف کی طرف توجہ نہیں کی، ورنہ امام مالکؒ کی طرح ان کا فیصلہ ترک رفع کا ہوتا۔

یہ تو ہوا امام بخاریؒ کے مستدلات پر لیے گئے جائزہ کا اختصار، جہاں تک اس سلسلے میں پیش کردہ حقائق کا تعلق ہے، تو ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ترک رفع راجح ہے جس کی وجوہ مندرجہ ذیل ہیں''۔ (ایضاح البخاری، حوالہ بالا)

یہ تحریر حضرت کے غیر معمولی تفقہ، آثار وروایات میں گہری بصیرت کے ساتھ، اختلافی مسائل میں ان کے ذوق اعتدال کی ترجمان ہے، جو علماء دیوبند کا خاصہ رہا ہے۔

باکمال مدرس اور خصوصیات تدریس:

حضرت الاستاذؒ کا سب سے بڑا کارنامہ آپ کی خدمت تدریس ہے، آپ باکمال مدرس تھے، علوم وفنون کا استحضار مثالی تھا، بغیر مطالعہ کے سبق پڑھانا انہیں گوارہ نہیں تھا، عجیب وغریب تفہیم اور ترسیلی صلاحیت کے مالک تھے، مشکل سے مشکل مضامین کو آسان الفاظ میں سمجھا دینا ان کے درس کی عجیب وغریب خصوصیت تھی، آسان الفاظ، دلکش انداز، سلیس تعبیریں، اچھوتے اشارے، موقع کے لحاظ سے علمی ظرافتیں اور خاص قسم کا

اسلوب گفتگو، آپ کی تدریس کے نمایاں اوصاف تھے۔
سنن ابن ماجہ کے درس میں قدر وجبر کا مسئلہ زیر بحث تھا، ابتداء درس میں ہی فرمایا: ''آج کا موضوع مسئلہ تقدیر ہے، اس مسئلہ کو بہت سے لوگ سمجھ نہیں سکے، اوراس کی تعبیر اپنی عقل نارسا کے ذریعہ کرنا چاہی اور ٹھوکر کھا گئے، جبکہ بیش ترلوگ آج بھی یہی سمجھتے ہیں کہ یہ مسئلہ بہت مشکل اور دقیق ہے؛ لیکن اللہ کی قدرت کہ حضرت الاستاذ سے جب میں نے پہلی دفعہ اس مسئلہ کی تشریح سنی، اسی دن سے میرا ذہن اہل سنت والجماعت کے موقف کی معقولیت پر مطمئن ہے، میرے لیے یہ مسئلہ کبھی بھی خلجان کا باعث نہیں ہوااور میں شرح صدر کے ساتھ کسی کو بھی یہ مسئلہ بہ آسانی سمجھا سکتا ہوں''، اور پھر مسئلہ تقدیر کی وضاحت شروع کی، نیز تقدیر کے فوائد پر ایسی شاندار تقریر کی، جو نہ پہلے سنی اور نہ ہی بعد میں؛ حضرت فرماتے تھے کہ عام طور سے لوگ جبریہ اور قدریہ کے پس منظر میں مسئلہ کو سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں، جب کہ معاملہ ایسا نہیں ہے، یہ مسئلہ زمانہ اور حالات کی پیداوار نہیں ہے، نصوص نے اس کی وضاحت کی ہے، اس کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے اوراس کے اسرار وحکم کا بھی تذکرہ کیا ہے۔
درس میں حضرت کی ایک خاص خوبی یہ تھی کہ آپ کی باتیں حشو وزوائد سے پاک اور معلومات سے لبریز ہوتیں، اس لیے ذہین طلبہ کے لیے آپ کا درس معلومات کا ایک خزانہ اوراسرار وحکم کا گنجینہ ہوتا تھا، ۲۰۰۸ء میں ہم لوگ دورۂ حدیث شریف میں تھے، تعلیمی سال کا آغاز تھا، کچھ قدیم شناسا احباب کے ساتھ ایک دن عصر کی نماز کے بعد میں، کھیتوں میں تفریح کے لیے نکلا، دورۂ حدیث کے نصاب کا ذکر چھڑ گیا، کچھ فضلاء نے سنن ابن ماجہ کے نصاب پر اعتراض کیا، ان کی گفتگو کا حاصل یہ تھا کہ اس میں موضوع احادیث بکثرت ہیں، بعض احباب نے کہا : اس کتاب کا نصاب صرف اس کا مقدمہ ہے، مزید کچھ ابواب ہونے چاہییے، اور گویا جتنے منہ، اتنی باتیں، اگلے دن میں درس گاہ پہونچا، میرے دل میں شکوک وشبہات بھرے ہوئے تھے، اور دل میں آرزو تھی کہ چند ایام کے بعد حضرت سے شناسائی ہوجائے گی تو ان موضوعات پر بات کروں گا، حضرت الاستاذؒ درس گاہ میں تشریف لائے اور مقدمۂ کتاب کی اہمیت پر ایک ایسا جملہ ارشاد فرمایا، جو شاید ایک گھنٹہ کی تقریر پر بھی بھاری ہے، فرمایا: ''یہ

مقدمہ اہل سنت والجماعت کے افکار ونظریات کا ایک جامع نصاب ہے، جو احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تیار ہوا ہے''، یہ جملہ سنتے ہی میرے ذہن ودماغ پر ایک بجلی سی کوند گئی، میں خوشی سے آبدیدہ ہو گیا، اطمینان قلب کے لیے گویا ایک غیبی سامان مجھے ہاتھ لگ گیا تھا، اور بعد میں اس جملہ کی حقیقت مزید کھل کر سامنے آئی۔

تکمیل ادب میں حضرت الاستاذؒ سے البلاغۃ الواضحۃ کا درس متعلق تھا، دراصل اسی سبق میں ہمیں حضرت کو سمجھنے اور قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، حضرت کا یہ درس علم وفن، شعر وادب، نکتہ آفرینی اور شیریں کلامی کا باغ وبہار ہوتا تھا، صاحب کتاب نے کتاب میں، قواعد بلاغت کی مشق وتمرین کے ذیل میں، کثرت سے بامعنی اشعار اور حکیمانہ اقوال نقل کیے ہیں، حضرت کسی دن کسی شعر یا پر حکمت محاورہ کی تشریح کرنے لگتے تو فکر وخیال کے چشمے بہنے لگتے، الفاظ ومعانی کے موتی رولتے اور مجلس کو زعفران زار بنا دیتے۔

اس تعلق سے بہت سے واقعات قابل ذکر ہیں؛ لیکن اختصار کے پیش نظر ان کو ترک کیا جا رہا ہے۔

ایک ممتاز محدث اور شارح حدیث:

حضرت ایک عظیم محدث تھے، اور تمام محدثانہ عظمتوں سے متصف، اردو میں صحیح البخاری کی مایۂ ناز شرح بنام ''ایضاح البخاری''، حضرت کی محدثانہ شان اور درایت حدیث میں آپ کی فنی مہارت کی روشن دلیل ہے، ایضاح البخاری سے حضرت کی زندگی کے متعدد وہ گوشے بھی نکھر کر سامنے آجاتے ہیں، جنہیں ان کے جاننے والے نظری طور پر جانتے ہوں گے، جیسے :

۱۔ خالص علمی اور دقیق مباحث کو انتہائی آسان اور ادبی رنگ وآہنگ میں پیش کرنا جہاں آپ کی تحریری صلاحیت کو واشگاف کرتا ہے، وہیں آپکی بے پناہ تفہیمی قدرت کا بھی پتہ دیتا ہے۔

۲۔ مذاہب ومسالک کے درمیان منصفانہ تقابلی مطالعہ پھر دلائل کی روشنی میں ترجیح وتصحیح کا معیار قائم کرنا آپ کی تبحر علمی، وسعت مطالعہ، خداداد فہم وفراست اور ادب الاختلاف کی غیر معمولی پاسداری کے رجحان کو واضح کرتا ہے۔

۳۔ تشریح حدیث میں مقام نبوت اور کلام نبوت کی شان کو ملحوظ خاطر رکھنا، اور سلف صالحین

کے تذکرے میں، چشم وابرو کو فرش راہ کر دینا آپ کی سلامتی طبع، روشن ضمیری، اور اسلاف سے بے پناہ عشق ومحبت کا پتہ دیتا ہے۔
۴۔ بالخصوص اختلافی مسائل میں حدیث کے تمام طرق کا استیعاب اور اس کی فنی خوبیوں اور خرابیوں کا اظہار، نیز رواۃ حدیث کے مقام ومرتبہ کی تعیین اور اس کی روشنی میں حدیث کی تشریح کرنا، فن حدیث میں آپ کی عبقری شان کو نمایاں کرتا ہے۔
۵۔ احادیث کی تشریح میں، علماء دیو بند کے افادات سے استفادہ اور ان کے افکار وخیالات کی، ان کے ذوق کے مطابق ترجمانی، اپنے افکار ونظریات میں ان کے تصلب اور شرح صدر کی کیفیت کو بیان کرتا ہے۔
ظاہر ہے ان کے بارے میں لوگ یہ سب جانتے ہی ہیں؛ لیکن ایضاح البخاری نہ ہوتی تو ان کو ثابت کرنا مشکل ہو جاتا۔
آپ کے درس حدیث میں شاید ہی کوئی دن ایسا ہو جب ہمیں کوئی علمی نکتہ ہاتھ نہ لگتا ہو، ایک دفعہ فرمایا: سنن ابن ماجہ کا مقام صحاح ستہ کے درمیان آخری ہے، کچھ علماء اسے صحاح ستہ میں بھی شامل نہیں کرتے؛ لیکن اس سے علامہ ابن ماجہ قزوینیؒ (۲۰۹ھ۔ ۲۷۳ھ) کے مقام ومرتبہ کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ بھی اصحاب تصنیف محدثین کے درمیان چھٹے نمبر پر ہیں؛ کیوں کہ انہوں نے اپنے اختیار سے، کچھ خاص مصلحت کے پیش نظر قبول حدیث کے لیے آسان شرطیں رکھیں، وہ چاہتے تو اپنے لیے امام بخاریؒ کی شرطوں کا بھی التزام کر سکتے تھے، اور ان کی سنن، صحیح البخاری کے ہم پلہ ہوتی، محدثین نے اپنے اپنے ذوق اور مصالح کے پیش نظر، احادیث نبویہ کو ضبط کیا ہے، جس سے ان کی تصنیفات کے درمیان مقام اور مرتبے کا فرق ہوا ہے؛ لیکن اس سے خود محدثین کا مقام متعین نہیں کیا جاسکتا، بعید نہیں کہ امام ابن ماجہؒ، روایت اور درایت کے باب میں امام بخاریؒ کے درجے کے ہوں؛ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض محدثین نے سرے سے کتاب ہی نہ لکھی ہو اور ان کی فہم حدیث مشہور محدثین سے بہت بڑھ کر ہو، اس لیے کتاب کے چھٹے نمبر پر ہونے سے صاحب کتاب کا نمبر چھ پر ہونا ضروری نہیں''، او کما قال۔
صحیح بات یہ ہے کہ حضرت کی زندگی کے بہت سے گوشے ایسے ہیں، جن پر بہت بسط کے

ساتھ لکھا جانا چاہیے؛ اور مجھے یقین ہے کہ حضرت الاستاذؒ کے تلامذہ اور متعلقین میں بہت سے ایسے اہل قلم ہیں جو اس گوہر نایاب کے کمالات وخصوصیات سے پردہ اٹھائیں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت الاستاذؒ کی شخصیت، ایک جامع ترین شخصیت تھی، اوران کی وفات کے ساتھ، علم وفن، شعر وادب، حکمت وظرافت، فہم وفراست، رسوخ فی العلم اور تصلب فی الدین نیز مکارم اخلاق اور بہت سی خوبیوں کا ایک پیکر جمیل ہم سے رخصت ہو گیا۔

میرے مشفق اور مربی استاذ حضرت مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری دامت برکاتہم نے جو حضرت الاستاذؒ کے فکر وفن کو سمجھنے والوں میں بہت نمایاں ہیں۔ حضرت کی جامع شخصیت کے حوالے سے بہت صحیح لکھا ہے کہ ”حضرت مولانا ریاست علی صاحب نور اللہ مرقدہ کی وفات، دار العلوم دیوبند میں ایک عہد کا خاتمہ ہے، ان کی ذات میں اللہ تعالی نے ایسے گوناگوں اوصاف جمع کردیے تھے، جو کسی ایک فرد میں کم ہی جمع ہوتے ہیں، جس سے ان کی شخصیت میں جامعیت کی شان پیدا ہوگئی تھی۔ اگر آپ رسوخ فی العلم، قوت استنباط، دقت نظر، سلاست بیان، فکر وتدبر، اصابت رائے، سلامتیٔ فکر، صبر وقناعت، زہد واستغناء، تقوی وپاک دامنی، جود وسخا، غریب پروری ومہمان نوازی، ادائے حقوق، عالی حوصلگی وسیر چشمی، خوش گفتاری ونرم خوئی، شفقت ومحبت، احساس ذمہ داری، ذہانت وظرافت، بھرپور خود اعتمادی کے ساتھ کامل تواضع، قوت فیصلہ، دور بینی، دیانت وامانت، اعلی تدریس وخطابت بے مثال نظم ونثر پر مثالی قدرت، سلیقۂ زندگی، آداب مجلس کی رعایت اور سادگی بے تکلفی کا مجسمہ نمونہ دیکھنا چاہیں تو وہ حضرت مولانا کی شخصیت تھی، اور یقین فرمائیں کہ ان اوصاف میں سے کسی کا تذکرہ بھرتی کے لیے نہیں کیا گیا؛ بلکہ ان کی شخصیت کے طویل مطالعہ پر مبنی ہے“۔ (مولانا محمد سلمان بجنوری، ماہنامہ دار العلوم دیوبند، بعنوان ”مدتوں رویا کریں گے جام وپیمانہ مجھے“، شمارہ ۷، جلد ۱۰۱، شوال ۱۴۳۸ھ مطابق: جولائی ۲۰۱۷ء، ص ۴)

اللہ تعالی حضرت والا کی مغفرت فرمائے، آپ کی خدمات کو قبول فرمائے اور اپنی شان کریمی کے مطابق معاملہ فرمائے۔ آمین۔

مقالات ومضامین

گوخاک کی آغوش میں وہ مہر مبیں ہے

مولانا ریاست علی ظفر بجنوریؒ ------احساسات وتأثرات

مفتی امانت علی قاسمی ☆

۲۳/شعبان ۱۴۳۸ھ مطابق ۲۰/مئی ۲۰۱۷ء سالانہ تعطیل میں اپنے وطن پہنچا، تو اسی دن ایک صاحب نے خبر دی کہ دارالعلوم دیوبند کے استاذ حدیث حضرت مولانا ریاست علی بجنوری کا انتقال ہو گیا ہے—انا للہ وانا الیہ راجعون-خبر چونکہ توقع کے بالکل خلاف تھی اس لئے جلدی یقین نہیں آیا، سفر میں ہونے کی وجہ سے واٹس ایپ بند تھا، خبر سن کر واٹس ایپ کھولا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ہر گروپ میں یہ خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل رہی ہے، فون پر بعض احباب سے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ معمولی علالت کے بعد آپ اس دنیائے آب وگل سے رخصت ہو گئے اور پوری قاسمی فضا مغموم کر گئے، دارالعلوم، دیوبند اور ان سے منسلک تمام اداروں پر غم کا سناٹا چھا گیا، آپ کے چلے جانے سے نہ صرف دارالعلوم کے بام و در سکتے میں تھے؛ بلکہ امت کا بہت بڑا طبقہ ماتم کناں تھا، لیکن کیا کیجئے قضاء وقدر پر کس کی اجارہ داری ہے اور موت سے کس کو رستگاری ہے ہر ایک کو مٹی کی چادر تان کر ملک بقا کا سفر کرنا ہے۔

اجل نے نہ کسری ہی چھوڑا نہ دارا
اسی سے سکندر سا فاتح بھی ہارا

واقعہ یہ ہے کہ جانے والا اپنی طبعی عمر پوری کر کے سفر آخرت کی طرف کوچ کر جاتا ہے، لیکن جانے والے میں بہت سے ایسے ہوتے ہیں جن کی یادیں بار بار آتی ہیں؛ بلکہ ستاتی اور رلاتی ہیں، جن کی روشن زندگی ان کے تاریک کوٹھری میں چلے جانے کے بعد بھی روشنی بکھیرتی ہیں، ستاروں کے مانند ان کی حیات مستعار ان کے رحلت کر جانے کے بعد بھی منزل کا پتہ دیتی ہے،

☆ استاذ دارالعلوم حیدرآباد

جن کے کردار وعمل کی بلندی ان کے روپوش ہوجانے کے بعد بھی عزم واستقامت کی تعلیم دیتی ہے ،جن کی زبان کی لطافت وشیرینی اور شفقت و پیار کی حلاوت برسوں تک شیرہ کا کام کرتی ہے ،اور احساسات کو تازگی وفکر وعمل کو تابندگی عطا کرتی ہے ،جن کا اخلاص وتقوی اور زہد واستغناء جینے کا قرینہ سکھلاتا ہے ۔انہی خلوص ووفا اور کردار وعمل کے ایک مجسم کا نام مولانا ریاست علی بجنوریؒ ہے ۔

گلستانِ دارالعلوم میں جن پھولوں سے ہر طرف خوشبو پھیل رہی ہے ان ہی پھولوں میں سے ایک پھول آپ تھے ؛ بلکہ گلِ سر سبد تھے ،دارالعلوم کے بام ودر کو جن قمقموں کی روشنی نے پر نور بنا رکھا ہے اور مناسب اور معتدل روشنی سے فکر واعتدال کی جو شمع روشن ہے اس کے جھومر آپ تھے ،تحریک دارالعلوم کی موجودہ عمارت جن ستونوں پہ قائم ہے اس کے ایک ستون آپ تھے ،اس لئے اگر کہا جائے کہ آپ کے چلے جانے سے برقی قمقموں کی روشنی ماند پڑ گئی ہے ، باغیچے کے پھول مرجھا گئے ہیں ،ایک مضبوط ستون کے گرجانے سے ایک خلا سا پیدا ہوگیا ہے تو شاید کوئی مبالغہ نہیں ہے ،یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالی چمنستان قاسمی کی آبیاری فرماتا رہے گا ،اور عمدہ سے عمدہ پھول اس گلستاں کو سدا بہار رکھیں گے ،اسلام کے فکر واعتدال کا یہ کوہ ہمالہ قیامت تک کے لئے ہے ،علم وفن کا یہ مضبوط قلعہ ہر دور میں اقبال کا مرد مومن اور اسلام کی علمی و فکری سرحد کا مرد مجاہد پیدا کرتا رہے گا ،لیکن جانے والے کی یاد تو ضرور آئے گی ،ان کی شفقت ،رس گھولتی اور دل کو چھو لیتی ان کی باتیں ،تکلف وتصنع سے خالی کی ان ادائیں ،ان کی مسکراہٹیں ان کے چاہنے والوں کو غم کے کچو کے دیتی رہے گی ،

روشن شب حیات کے مہتاب کی طرح | آتی ہے ان کی یاد حسیں خواب کی طرح
ممکن نہیں ہے ان سے زمانہ ہو بے نیاز | وہ تھے جہاں میں گوہر نایاب کی طرح

مولانا ریاست علی ظفر بجنوریؒ علم وفن کے آفتاب عالم تاب تھے ،فن حدیث کے روشن مینار تھے ،ریاست علم وادب کے تاجدار تھے ،وہ ہمہ گیر و ہمہ جہت صلاحیت کے مالک تھے ،ان کی فکر میں اعتدال کے ساتھ آفاقیت تھی ،اللہ تعالی نے علم وادب کے قیمتی گوہر سے مالا مال کیا تھا اور مختلف علوم وفنون میں ملکہ عطا فرمایا تھا ؛لیکن انہوں نے حدیث کی خدمت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا اور حدیث کا درس دیتے اور حدیث کی شرح لکھتے ان کی روح قفص عنصری

کو پرواز ہوئی یہ یقینا خاتمہ بالخیر کی طرف اشارہ ہے علامہ شبلی نعمانی نے اپنے تعلق سے ایک شعر لکھا تھا جو یہاں موزوں معلوم ہوتا ہے ؎

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا ہے
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

ربع صدی سے زائد عرصے تک انہوں نے درس وتدریس کا فریضہ انجام دیا، ہزاروں تلامذہ پوری دنیا میں ان کی روشن تعلیمات کی روشنی بکھیر رہے ہیں جو ان کے لئے بہترین صدقہ جاریہ ہے، آپ مولانا فخر الدینؒ صاحب سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کے شاگرد خاص تھے اور حدیث میں انہی کے رنگ وآہنگ کی پیروی کرتے تھے، ''ایضاح البخاری'' کے نام سے آپ بخاری کی شرح لکھ رہے تھے جو کہ مولانا فخر الدین کے افادات کا مجموعہ ہے یہ شرح بخاری کی اردو میں سب سے جامع اور مبسوط شرح ہے اس کی دس جلدیں طبع ہو کر قارئین کی آنکھوں کا سرمہ بن چکی ہیں، خدا کرے کہ باقی جلدوں کے منظر عام پر آنے کا سامان پیدا ہو۔

مولانا موصوف کی زندگی پر ایک نظر ڈالئے جو چیز سب سے زیادہ ان کی زندگی میں نمایاں اور ابھر کر سامنے آتی ہے وہ ہے ان کی متواضعانہ طرز زندگی، ہر جگہ دیکھئے، بڑوں کے ساتھ، چھوٹوں کے ساتھ، اپنوں کے ساتھ، پرایوں کے ساتھ، نجی محفل میں یا پھر سیمینار اور کانفرنس میں ہر جگہ تواضع وخاکساری آپ کا خاص وصف دکھائی دیتا ہے، آپ طلبہ کے ہجوم میں بھی اس طرح چلتے جیسے کوئی طالب علم جارہا ہو، غیر شناسا شخص آپ کے حلیے سے کبھی آپ کو نہیں پہچان سکتا تھا، احقر نے فراغت کے بعد گھر پر بھی آپ سے ملاقات کی تو آپ کا یہی وصف نمایاں طور پر نوٹ کر پایا اور دومرتبہ جمعیۃ العلماء ہند کے زیر اہتمام ہونے والے مباحث فقہیہ کے پروگرام میں آپ سے ملاقات کی تو آپ کی یہی صفت دل کو دستک دیتی ہوئی نظر آئی ۔مباحث فقہیہ کا گیارہواں اجلاس دارالعلوم حیدرآباد میں ہوا تھا اور تیرہواں اجلاس مدراس کے حج ہاؤس میں ہر جگہ آپ کی تقریر ہوتی تھی، لیکن حیرت ہے ہر جگہ آپ نے اپنے خطاب میں یہی کہا کہ میں یہاں کچھ سیکھنے، آپ کو سننے اور آپ لوگوں سے ملاقات کے لئے آتا ہوں۔ اندازا لگائیے کہ دارالعلوم کی مسند پر چار دہائی تک درس دینے والا، دارالعلوم کا مؤقر اور ممتاز استاذ

کس سادگی سے کہتا ہے کہ میں تو آپ لوگوں کو سننے آتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ اسی تواضع و خاکساری کی صفت نے آپ کو بلندی کے اس عظیم منصب تک پہنچا دیا کہ آپ کے ملک عدم چلے جانے کے بعد آپ کا ہر شناسا آپ کا ذکر جمیل کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ آپ کی اس سادگی اور متواضعانہ زندگی کو دیکھ کر من تواضع للہ رفعہ اللّٰہ کی عملی تفسیر سامنے آجاتی ہے۔

مولانا موصوف بلند اخلاق وصفات کے حامل تھے، طلبہ کے ساتھ شفقت و پیار ان کا خاص وصف تھا، طبیعت میں سادگی اور نرمی تھی، ورع وتقوی، خلوص وللّٰہیت، خوف وخشیت انابت الی اللہ، زہد واستغناء آپ کا امتیاز تھا، غم خواری ودلداری اور غرباء پروری، آپ کی زندگی کا لازمہ تھا، آپ سادگی کے پیکر مجسم تھے، اور یہ سادگی آپ کے لباس، چال ڈھال، طرز زندگی اور رسم معاشرت سے ہویدا تھی، سخاوت وفیاضی اور مہمان نوازی میں آپ معروف تھے، سچ پوچھئے تو آپ خلیق وملنسار اور بڑے نرم گفتار تھے، اسی لئے اساتذہ، طلبہ اور ملنے والوں کا آپ کے مے خانے میں ہجوم لگا رہتا تھا۔

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانہ میں
فقط یہ بات کہ پیر مغاں ہے مرد خلیق

آپ کا شمار دارالعلوم کے مؤقر اساتذہ میں ہوتا تھا، آپ دارالعلوم کے مختلف مؤقر عہدوں کی زینت بن چکے تھے، نائب مہتمم، ناظم تعلیمات، نگراں شیخ الہند اکیڈمی، کے علاوہ آپ جمعیۃ العلماء ہند کے نائب صدر تھے، آپ اپنی متوازن اور پختہ رائے کے لئے جانے جاتے تھے، دارالعلوم میں آپ کی رائے اور فکر کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی اور اہم میٹنگوں میں آپ کی شرکت لازمی ہوا کرتی تھی، آپ کی فکر میں اعتدال تھا اور اس اعتدال پر تصلب سے قائم رہتے تھے، ۲۰۱۰ھ کی بات ہے دارالعلوم وقف میں فقہ اکیڈمی کا سیمینار ہو رہا تھا عنوان تھا ''مدارس اسلامیہ میں فقہ کی تدریس — منہج اور طریقہ کار''، لیکن اس میں بہت سے شرکاء تبدیلی نصاب پر بحث کر رہے تھے، یہ وہ عنوان ہے جس میں ہندوستان کے بہت سے اہل علم، مفکرین کی علیحدہ علیحدہ رائے ہے خود دیوبند میں بھی ایسے ارباب فکر ہیں جو تبدیلی نصاب کے قائل ہی نہیں؛ بلکہ محرک ہیں اس لئے گرما گرم بحث جاری تھی کہ موجودہ حالات میں نصاب کی تبدیلی ناگزیر ہے، اسی

دوران حضرت الاستاذ کا نام پیش ہو گیا آپ تشریف لائے اور بڑے ہی سنجیدہ انداز میں گفتگو کا آغاز فرمایا جس کا حاصل یہ تھا ''کہ بھائی نصاب میں جزوی تبدیلی تو ہوتی رہتی ہے دارالعلوم میں پہلے بہت سی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں اب وہ نہیں پڑھائی جاتی ہے، جہاں تک مسئلہ ہے کلی تبدیلی کا یا عصری علوم کو شامل کرنے کا تو جب تک اس کا تجربہ نہ ہو جائے اس کے مفید یا مضر ہونے کا فیصلہ کیسے کیا جا سکتا ہے اس لئے جو لوگ تبدیلی کی بات کرتے ہیں وہ کوئی ادارہ قائم کر کے اس میں نئے نصاب کا تجربہ کر لیں اگر مفید ثابت ہوا تو ہم بھی قبول کر لیں گے'' آپ کا یہ تجزیہ اگر چہ الزامی تھا؛ لیکن اس وقت کے لئے یہی ضروری تھا آپ نے اپنی گفتگو میں اپنا اور دارالعلوم کا موقف پیش کر دیا کہ جو نصاب ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی ہے اور جو لوگ تبدیلی کی بات کرتے ہیں پہلے وہ نیا نصاب لائیں اور اس کا تجربہ پیش کریں، آپ کی اس تقریر کے بعد مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ حضرات ہمارا یہ پروگرام نصاب کی تبدیلی سے متعلق ہے ہی نہیں، اس لئے موضوع کو دوسرے رخ کی طرف نہ لے جائیں اس طرح بات ختم ہو گئی۔

حضرت کی معتدل فکر اور پختہ رائے کا اندازا ایک اور واقعے سے لگائیے، دیوبند میں جمعیۃ العلماء کا پروگرام ہو رہا تھا، آپ کو مائک پر مدعو کیا گیا آپ نے مختصر خطاب کیا جس میں آپ نے فرمایا کہ ''اسلام امن و اعتدال کا مذہب ہے اور دیوبندیت امن و اعتدال کا مسلک ہے''، جملہ بہت مختصر ہے؛ لیکن اس میں دیوبندیت کی بھر پور ترجمانی ہے آپ نے اس مختصر جملہ میں اس کی وضاحت فرمادی کہ قرآن نے اسلام کو امت وسط یعنی معتدل دین قرار دیا ہے اور دیوبندیت اسی راہ اعتدال پر گامزن فکر و نظر کا نام ہے۔

اللہ تعالی نے آپ کو زبان و بیان اور قرطاس و قلم ہر دو کا تاجدار بنایا تھا، بولتے تو چھوٹے چھوٹے جملوں کے ذریعہ سامعین پر سحر کر جاتے اور لکھتے تو قارئین پر وجد سا طاری ہو جاتا، آپ دو سال تک ماہنامہ دارالعلوم کے مدیر رہے، اس عرصے میں آپ نے متعدد مضامین لکھے، اس کے علاوہ بھی آپ کے قلم ژرف نگار سے متعدد تحقیقی و تخلیقی مضامین تاریخ کی زینت بن چکے ہیں، آپ اردو کے انشاء پرداز ادیب تھے ''شوری کی شرعی حیثیت'' اور ''ایضاح البخاری'' کتابی شکل میں آپ کی تصنیفی خدمات میں دو عظیم شاہ کار ہیں، اس کے ساتھ آپ بلند پایہ

شاعر تھے، آپ نے شاعری کو اپنا مشغلہ نہیں بنایا تھا اس کے باوجود آپ کا شعری مجموعہ "نغمہ سحر" کے نام سے طبع ہو کر قبولیت حاصل کر چکا ہے، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس نے آپ کی شاعری کو عروج بخشا اور شاعر کی حیثیت سے آپ کو پوری دنیا میں متعارف کرایا وہ دارالعلوم کا ترانہ ہے، یہ ترانہ آپ کی فنی مہارت کا عملی نمونہ ہے، جب میں دارالعلوم آنے سے پہلے مدرسہ ریاض العلوم میں زیر تعلیم تھا تو وہاں اپنے ایک ساتھی کے پاس "دارالعلوم کاپی" دیکھی جس کی پشت پہ یہ ترانہ ثبت تھا، سچ پوچھئے آپ کے دیدار سے پہلے اسی ترانہ کے ذریعہ آپ تک رسائی حاصل ہوئی اور اسی ترانہ نے آپ سے ملنے اور آپ کو دیکھنے کا شوق پیدا کیا، ترانہ کیا ہے اردو ادب کا ابلتا دریا ہے، جس کی تہ میں آپ کو لعل و گہر ہی ملیں گے، ترانہ پڑھیے تو ایسا لگتا کہ شاعر تاریخ کی سیر کرا رہا ہے، دیوبندیت کی تشریح کر رہا ہے، دارالعلوم کی خدمات کا تذکرہ کر رہا ہے، اکابر دیوبند سے روشناس کرا رہا ہے، دارالعلوم کے کردار کی منظر کشی کر رہا ہے اور یہ سب کچھ الفاظ و تعبیرات اور نظم و قوافی کے بلند معیار پر اتر کر ہو رہا ہے، جب ذکر ترانہ کا آ ہی گیا ہے تو چند اشعار پڑھ کر آپ بھی اپنے قلب و ذہن کو تازگی دیجئے اور اشعار کی چاشنی کا لطف اٹھائیے۔

مہتاب یہاں کے ذروں کو ہر روز منانے آتا ہے — خورشید یہاں کے غنچوں کو ہر صبح جگانے آتا ہے

جو وادی فاراں سے اٹھی گونجی ہے وہی تکبیر یہاں — ہستی کی صنم خانوں کے لئے ہوتا ہے حرم تعمیر یہاں

کہسار یہاں دب جاتے ہیں طوفان یہاں رک جاتے ہیں — اس کاخ فقیری کے آگے شاہوں کے محل جھک جاتے ہیں

حضرت الاستاذ گونا گوں صفات کے حامل تھے، فکر و نظر کے بہت سے چشمے آپ سے ابلتے تھے، علم و ادب کے بہت سے سوتے آپ سے نکلتے تھے، شعر و شاعری ہو کہ قرطاس و قلم کی رفاقت، زبان و بیان ہو یا فن حدیث کی مہارت ہر جگہ آپ کی ایک الگ ہی شان تھی یہ حقیر تو ہزاروں کی بھیڑ میں معمولی سا طالب تھا، جس کی ان کے فضل و کمال تک کیا رسائی ہو سکتی تھی؟ اور اس سب پر مستزاد یہ کہ میرے قلم میں وہ طاقت کہاں ہے جو ان کے حالات کی مکمل ترجمانی کر سکے۔

یہ رمزی بے بصیرت ہے تیرے اوصاف کیا جانے
جو ہم رتبہ ہو تیرا وہ تیرے اوصاف پہچانے

اس لئے اپنی اس تحریر کو دارالعلوم دیوبند کے ایک مؤقر استاذ، ماہنامہ دارالعلوم کے مدیر حضرت مولانا سلمان صاحب بجنوری دامت برکاتہم کے ایک اقتباس پر ختم کرتا ہوں جو مولانا موصوف کی علمی وفکری زندگی سے اچھی طرح واقف ہیں اور انہوں نے جولکھا ہے الفاظ کی ذمہ داری کے ساتھ لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

حضرت مولانا ریاست علی صاحب نوراللہ مرقدہ کی وفات دیوبند میں ایک عہد کا خاتمہ ہے، ان کی ذات میں اللہ تعالی نے ایسے گونا گوں اوصاف جمع کردئے تھے جو کسی ایک فرد میں کم ہی جمع ہوتے ہیں جس سے ان کی شخصیت میں جامعیت کی شان پیدا ہوگئی تھی، اگر آپ رسوخ فی العلم، قوت استنباط، دقت نظر، سلاست بیان، فکر وتدبر، اصابت رائے، سلامتی فکر، صبر وقناعت، زہد واستغناء، تقوی و پاک دامنی، جود وسخا، غریب پروری ومہمان نوازی، ادائے حقوق، عالی حوصلگی وسیر چشمی، خوش گفتاری ونرم خوئی، شفقت ومحبت واحساس ذمہ داری، ذہانت وظرافت بھرپور خوداعتمادی کے ساتھ کامل تواضع، قوت فیصلہ دور بینی، دیانت وامانت، اعلی تدریس وخطابتیں، بے مثال نظم ونثر پر مثالی قدرت، سلیقہ زندگی، آداب مجلس کی رعایت اور سادگی وبے تکلفی کا مجسمہ نمونہ دیکھنا چاہیں تو وہ حضرت مولانا کی شخصیت تھی اور یقین فرمائیں کہ ان اوصاف میں کسی کا تذکرہ بھرتی کے لئے نہیں کیا گیا؛ بلکہ ان کی شخصیت کے طویل مطالعہ پر مبنی ہے

(ماہنامہ دارالعلوم شوال ۱۴۳۸ھ)

اللہ تعالی مولانا کی خدمات کو قبول فرمائے ان کے نقش پا کی پیروی نصیب فرمائے اوران کے مشن، تحریک، فکر اور ان کے ادھورے خوابوں کو تکمیل تک پہنچائے۔

گو خاک کی آغوش میں وہ مہر مبیں ہے
مومن کے لئے موت مگر موت نہیں ہے
نغمہ سحر ص ۱۳۰:

مقالات ومضامین

مقبول جو ہوں شاذ ہیں، قابل تو بہت ہیں

حضرت مولانا ریاست علی بجنوری نوراللہ مرقدہ

محمد تبریز عالم حلیمی قاسمی ☆

دارالعلوم دیوبند بلاشبہ ایک چمن ہے ایک ایسا چمن جس کے پھولوں سے دنیائے علم وعمل میں خوشبو ہے، واقعی اِس چمن کا ہر پھول ایک شعلہ اور ہر سرو ایک مینارہ ہے اور واقعتاً اس خاک کے ذرے ذرے سے شرر بیدار ہوتے ہیں اور ایسا اِس وجہ سے ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی سب سے بڑی شناخت اِخلاص اور تقویٰ ہے، اس کی ظاہری و باطنی تعمیر میں یہی روح کارفرما ہے، اس کے در و دیوار میں بے لوثی اور للّٰہیت کی مہک بسی ہوئی ہے۔

جیسے چراغ کی روشنی کی جہت طے کرنا مشکل ہے ٹھیک اسی طرح بعض چیدہ شخصیات کی علمی وعملی زندگی کی سمت طے کرنا بعض دفعہ مشکل ہوجاتا ہے، بات اگر علم وہنر کے گہوارے سے تعلق رکھنے والی مقبول اور ہر دل عزیز شخصیت کی ہو تو یہ کام خاصا دشوار ہوجاتا ہے، افلاک کے تاروں سے بلند تر مقام کی حامل شخصیت پر خامہ فرسائی کے لیے آزاد، دریابادی اور شورش جیسے انشا پرداز کا قلم درکار ہے، ورنہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا کا شکوہ دامن گیر ہوجانا یقینی امر ہے۔

میرے اور مجھ جیسے لاکھوں شاگردوں کے استاذ محترم، مشفق ومکرم حضرت مولانا ریاست علی بجنوری نوراللہ مرقدہ، سابق استاذِ حدیث وسابق ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند کی نورانی، بافیض، مردم ساز، خدارسیدہ اور مختلف الجہات شخصیت کا سانحہ ارتحال واقعتاً دارالعلوم دیوبند کے لیے ایک بڑا خسارہ ہے، اگرچہ ان کی وفات کی وجہ سے دارالعلوم دیوبند اور کائنات کا نظام مختل نہیں ہوگا، اگرچہ اِس مینارۂ نور کی تابانی وضوفشانی ماند نہیں پڑے گی؛ لیکن شمس وقمر کی فطری روشنی میں بھی تاریکی کا احساس ختم ہونا دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے ایک طالب علم

☆ استاذ دارالعلوم حیدرآباد۔

کے لیے مشکل ضرور ہے، علم وعمل اور شرافت ونجابت کے پیکر، اکابرِ دیوبند کا پرتو، ایک تابندہ علمی شخصیت، جمال وکمال کا مظہر، روایاتِ اکابر کا عنوان، علم وفضل، دانش وبینش اور فکروتدبر کی علامت، تاجدارِ شعروادب، اپنے اساتذہ کے علوم کے شارح، علم وادب کا حسین سنگم، دارالعلوم دیوبند کی علمی اور تاریخی روایتوں کے پاسبان، یتیموں اور بیواؤں کے کفیل، طلبہ کے خیر خواہ کو قلب ودماغ سے نکالنا اور فراموش کرنا ممکن نہیں ؎

فروغِ شمع جو اَب ہے، رہے گی رہتی دنیا تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی، ہوتی جاتی ہے

حضرت الاستاذ مولانا نور عالم خلیل امینی رئیس تحریر مجلہ ''الداعی'' عربی واستاذ ادبِ عربی دارالعلوم دیوبند نے ایک جگہ لکھا ہے : ''کسی بڑے اور اہلِ کمال میں سب سے بڑا وصف اس کی تواضع اور خاکساری ہی ہوسکتی ہے، یہ تمام صفات کی ماں، ساری خوبیوں کی جڑ اور اچھائیوں کا سرچشمہ ہے، اِس کے بغیر ہر بڑائی برائی ہے اور اس کے ساتھ ہر عیب چشم پوشی کے لائق ہے، بڑوں کی بڑائی کیلئے یہ سب سے قیمتی تاج ہے، اگر کوئی بڑا اِس سے عاری ہے تو وہ بڑا ہو ہی نہیں سکتا''۔

حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی بجنوری نور اللہ مرقدہ کی ذات میں تواضع وخاکساری کی صفت حد درجہ تھی، کیا چھوٹے کیا بڑے سبھی اِس کے قائل ہیں، کوئی اِس کا منکر نہیں، آپ اپنی تحریروں میں اپنے نام کے ساتھ کوئی امتیازی القاب نہ لکھتے تھے نہ پسند فرماتے تھے، شناخت کے لیے عموماً ''خادم تدریس دارالعلوم دیوبند'' کا سادہ سا جملہ لکھا کرتے تھے، اپنے لیے صدارت یا کرسیٔ صدارت کو قطعی پسند نہیں فرماتے تھے مجلس میں کہیں بھی بیٹھ جایا کرتے تھے، مجلس میں پاؤں پھیلا کر نہیں بیٹھتے تھے، عموماً پیالے میں پانی نوش فرماتے تھے، سادہ لباس زیب تن فرماتے تھے، لباس کی سادگی ایسی کہ جو شخص پہلے سے متعارف نہ ہو وہ وضع قطع سے فیصلہ نہیں کرسکتا تھا کہ یہی مولانا ریاست علی بجنوری ہیں، یہی شوریٰ کی شرعی حیثیت کے مصنف ہیں، یہی ترانۂ دارالعلوم کے خالق ہیں، یہی ایک پختہ کار اور منفرد حیثیت کے شاعر ہیں اور یہی ماضی میں ماہنامہ دارالعلوم کے مدیر اور تعلیمات کے ناظم رہ چکے ہیں اور اب یہی اپنے استاذ محترم کی تقریرِ بخاری بنام ایضاح البخاری شائع

کررہے ہیں اور یہی وہ ممتاز شخص ہیں جن کی اصابتِ رائے، بروقت مفید مشوروں، ہوش مندی اور دوراندیشی سے دارالعلوم دیوبند، جمعیت علماء ہند، دارۃ المباحث الفقہیہ اور دیگر وابستگانِ علم وادب اور اساتذہ وطلبہ مستفید و مستفیض ہوتے رہتے ہیں اور یہی وہ روشنی ہیں جنھوں نے اندھیروں میں چراغ جلائے ہیں، علمی کام کرنے والے اساتذہ کی ایک کھیپ تیار کردی ہے اور یہی وہ یکتائے زمانہ شخص ہیں جنھوں نے قطروں کو دریا بنایا ہے، یقینا کسی شخص کی شخصیت میں اتنی ساری صفات وخصوصیات پنہاں ہوں اور وہ انھیں ظاہر نہ ہونے دے، اِسی کا دوسرا نام خاکساری اور تواضع ہے؛ لیکن قدرت نے رفعت وشہرت، قدرومنزلت کو اِسی تواضع سے مربوط کیا ہے، اِسی تواضع وخاکساری کے خمیر سے فلک کے تاروں سے بلند تر مقام بنتا ہے، جو حضرت کے حصہ میں آیا اور خوب آیا، سچ ہے ؎

کہ دانہ خاک میں مل کر گلِ گلزار ہوتا ہے

دارالعلوم دیوبند میں سہ سالہ طالب علمی کے دور میں حضرت الاستاذ کو دور سے ہی دیکھنے اور پڑھنے کا موقع ملتا رہا، بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ اِس دوران حضرت سے عدمِ قربت میری بدنصیبی کا حصہ تھی؛ البتہ معین مدرسی کے دو سالوں میں کبھی کبھار حضرت کی مجلس میں حاضری کا موقع ملتا رہا وہ حاضری میری خوش نصیبی کا حصہ تھی، دورانِ طالب علمی کی بدنصیبی، خوش نصیبی میں اس وقت تبدیل ہوئی جب دارالعلوم حیدرآباد کی تدریسی ملازمت کا موقع ملا اور ہر سال شوال میں مدرسہ کے کام سے دارالعلوم دیوبند حاضری ہوتی رہی، طالب علمی اور معین مدرسی کا زمانہ گذار کر دارالعلوم دیوبند سے جانے کے بعد لگاتار سات سالوں تک دیوبند جب بھی حاضر ہوا حضرت الاستاذ سے ملنے کا شرف ملتا رہا، ہر سال اِس احساس میں اضافہ ہوتا رہا کہ حضرت الاستاذ میں ''پدرانہ شفقت'' کا عنصر غالب ہے، وہ اپنے دل میں اپنے طلبہ کے تئیں ''درد'' رکھتے ہیں، حافظہ اور ذاتی ڈائری سے بیتے دنوں کی کچھ یادوں کو زندگی دے کر دلی تسلی کا سامان فراہم کرتا ہوں، ان واقعات ومشاہدات میں ایک طالب علم کیلئے عبرت وموعظت کا کافی سامان ہے۔

(الف) حضرت کی زندگی ''ہٹو بچو'' کی کیفیت سے کوسوں دور تھی، اپنی بڑائی اور اپنا

امتیاز نمایاں کرنے کا جذبہ نہ کے درجہ میں تھا، جس سال حضرت مولانا فدائے ملت اسعد مدنیؒ کا انتقال ہوا، میں دارالعلوم میں نووارد تھا، جنازے کی نماز دارالعلوم میں ادا ہورہی تھی، ازدحام کافی تھا، حضرت کو دیکھا اکیلے، کنارے طلبہ کی پچھلی صف میں کھڑے ہیں، ساتھ میں نہ کوئی خادم نہ کوئی اور، میں بہت متاثر ہوا کہ اس پائے کا محدث اکیلا کنارے کھڑا ہے، عموماً تنہا ہی ہوتے تھے، اس سادہ انسان کی سادہ زندگی کا منظر نگاہوں میں آج بھی تازہ ہے، آج وہ راستہ، وہ گلی، وہ موڑ، وہ زینہ، وہ مسندِ درس اور وہ در و دیوار ماتم کناں ہیں، انھیں سادگی کا ایسا تاج محل اب کبھی دکھائی نہیں دے گا۔

(ب) ۱۴۳۴ھ کی بات ہے، دارالعلوم حاضری کے موقع سے حضرت کی مجلس میں حاضری ہوئی، مختصر بات چیت ہوئی، میں شروع سے ہی کم گو ہوں، میں نے ڈرتے ہوئے حضرت سے اپنی بیمار اہلیہ کی خاطر تعویذ کی درخواست کی، حضرت فوراً تیار ہوگئے اور کہا کل کو لے لینا دوسرے دن حاضر ہوا، اختتامِ مجلس پر میں نے یاد دلایا تو کہا : بیٹے! میں بھول گیا کل کو آتے ہی یاد دلانا، حضرت کا بیٹے کہنے کا انداز اِتنا نرالہ اور مخلصانہ ہوتا تھا کہ دل تھوڑی دیر کے لیے بھول جاتا تھا کہ وہ کہاں ہے، وہ آواز آج بھی کانوں میں رس گھولتی معلوم ہورہی ہے، خیر دوسرے دن حاضر ہوا فوراً اپنے ہاتھ سے لکھ کر تعویذ عنایت فرمایا، یہ معاملہ صرف میرے ساتھ خاص نہیں تھا؛ بلکہ ہر کس و ناکس حضرت کے تعویذات سے فائدہ اٹھاتا تھا آپ کسی کو منع نہیں کرتے تھے اور نہ ہی اس تعویذ پر کچھ عوض لیتے تھے، تعویذات و عملیات سے وابستہ افراد کا عالم، عامل، پابند شریعت، متبع سنت، صدقِ مقال و اکل حلال کا حامل ہونا نہایت ضروری ہے، حضرت کے یہاں یہ خصوصیات بدرجہ اتم موجود تھیں، اصلی خاتم مقطعات، مدنی تختی اور لوح عزیزی جیسے تعویذات جو حضرت مدنی، حضرت تھانوی، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور شیخ احمد بن علی بونی رحمھم اللہ کے قابل اعتماد مجرب تعویذات میں ہیں، ہمارے اکابر و اسلاف نے ایک خاص ضابطہ کے تحت اس پہلو سے فائدہ اٹھانے کے طریقے بتلائے ہیں جس میں اجازت کو شرط قرار دیا گیا ہے، حضرت کو اِس سلسلہ کا معتبر ترین آدمی مانا جاتا تھا، شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ سے حضرت مولانا کے پھوپھا مولانا سلطان الحق صاحبؒ سابق ناظم کتب خانہ دارالعلوم

دیوبند کواوران سے حضرت نوراللہ مرقدہ کواجازت تھی،حضرت نے اِس فیض کوعام کرنے کے لیے''کاشانۂ رحمت'' نامی ایک ادارہ بھی قائم فرمایا تھا، یہ ادارہ آج بھی عملیات کی شرائط اور تعویذات کے آداب کو پورا کرکےان تبرکات سے
عوام الناس کومستفید کررہاہے۔

(ج) ستمبر ۲۰۱۲ء کی بات ہے حضرت کے صاحب زادے مولانا سفیان صاحب نے ہماری دعوت کی،جس کی تقریب یوں ہوئی کہ میں جن صاحب (مفتی اسعداعظمی صاحب سابق استاذ دارالعلوم حیدرآباد) کے ساتھ دیوبند آیا تھا وہ مولانا سفیان صاحب کے دوست تھے، انھوں نے ان کی دعوت کی تو میری بھی ہوگئی، رات کے کھانے میں دسترخوان پر حضرت بھی تشریف فرما تھے، مجھے بڑی خوشی ہوئی، کھانا آیا،حضرت نے اپنی قیام گاہ اور ملاقاتی کمرہ کی تعمیر اس انداز کی کرائی ہے کہ مطبخ سے نیچے کی جانب ایک متوسط سائز کی کھڑکی حضرت کے ملاقاتی کمرہ میں کھلتی ہے ٹرالی نما لکڑی کا ایک متوسط سائز کا تختہ ہوتا تھا، اسی پر کھانا، برتن اور ضروری اشیاء بڑے سلیقے سے رکھ کر کمرے کی جانب کھسکا دیا جاتا ہے، بہت آسانی اور کم وقت میں سارا سامان کمرے میں آجاتا تھا، وہیں پاس میں دسترخوان ہوتا تھا، بہرحال کھانا پروسا گیا،حضرت کے ساتھ اول آخر ہم طعامی کا یہ شرف ایک ایسا شرف ہے اور ایک ایسی یاد ہے جسے ہمیشہ سمیٹ کر رکھوں گا اور جس کی یادیں ہمیشہ قلب وجگر اور ذہن ونظر میں تازہ رہیں گی، حضرت اور صاحب زادے نے بڑے ہی اخلاص واکرام کا مظاہرہ کیا، کھانے کے دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا، میرے وجود کو ہلا کر رکھ دیا، ہوا یہ کہ دسترخوان پر جہاں میں بیٹھا تھا وہ اصلاً راستہ تھا اور میرے پیچھے حضرت کے سونے کے لیے ایک تخت رکھا ہوا تھا چوں کہ سب لوگ دسترخوان پر تھے، باہر سے کوئی آنے والا نہیں تھا؛ اِس لیے میں اسی راستہ پر بیٹھ گیا تھا اور میری پیٹھ تخت سے لگی ہوئی تھی، حضرت نے معمولی مقدار میں کھانا لیا اور اٹھ گئے، اِس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ہمیں حضرت کی وجہ سے تکلف ہو رہا تھا، ان کی غیر موجودگی میں بے تکلفی رہے گی، یہ بھی ایک سیکھنے کی چیز تھی جو میں نے سیکھی، حضرت کو ہاتھ دھونے کے لیے باہر جانا تھا، میں نے محسوس کیا حضرت دسترخوان پر ہاتھ دھونا مہمان نوازی کی توہین سمجھ رہے ہیں، خیر حضرت اٹھے، تھوڑی دیر ٹہل کر تخت پر بیٹھ گئے جیسے

کچھ کام ہو، میری توجہ اس جانب سے ہٹ گئی، تھوڑی دیر کے بعد تخت پر کھڑے ہوکر دوسری جانب گئے اور ہاتھ دھولیے، حضرت دارالعلوم کے موقر استاذِ حدیث ہونے کے ساتھ خود میرے استاذ تھے، گھر اور دسترخوان انھیں کے تھے اور چاہتے بلکہ یہ ان کا حق تھا کہ وہ مجھے یا اپنے صاحب زادے کو حکم دیتے کہ ذرا راستہ دینا؛ لیکن واہ رے اخلاق وتواضع کا پیکر مجسم، گھٹنے کا درد برداشت کرلیا، ادنیٰ درجہ کے مہمان کی معمولی زحمت برداشت کرنا گوارہ نہیں کیا، اور سنیے! کھانے کے بعد تھوڑی دیر گفتگو ہوئی، کہنے لگے آپ لوگ عصر بعد آئے تھے میں پہچان نہیں سکا تھا، بعد میں سوچا ملیں گے تو معذرت کروں گا، اِس جملے میں ادب وتہذیب، شفقت ومحبت، اخلاص واپنائیت، تواضع وانکساری کا مضمون سمٹتا ہوا نظر آیا۔

اِس واقعہ نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ دورانِ طالب علمی حضرت کے تعلق سے قلب وذہن میں جو غلط فہمیاں تھیں، یک لخت سب کافور ہوگئیں؛ بلکہ جمعیت علمائے ہند کے جھگڑے میں جب طلبہ کے درمیان گرما گرم بحث ہوتی تھی اور حضرت الاستاذ کا تذکرہ ہوتا تو بعض طلبہ حضرت کے خلاف بہت سی باتیں کہتے تھے، ریاست کی سیاست جیسے جملے اکثر کانوں میں پڑہی جاتے تھے، میری بدنصیبی اور حرماں نصیبی تھی کہ میں اس جملے کی خاموش یا زبانی تائید وتصدیق کی حماقت کربیٹھتا تھا اور شاید یہ بدنصیبی ہی کا نتیجہ تھا کہ دورانِ طالب علمی حضرت کے پاس جانے کی توفیق نہ ملی، اور ایک مرتبہ جب میں نے اپنا تعارف کرایا کہ میں نے ادب میں آپ سے البلاغۃ الواضحہ پڑھی ہے اور دو سال معین مدرسی کے شعبہ میں خدمت کی ہے تو حضرت نے فرمایا: بیٹے تم کبھی آتے نہیں تھے، اس وقت مجھے بہت شرمندگی ہوئی تھی؛ لیکن اس جملے میں، میں نے شکوہ کے ساتھ اپنائیت کی خوشبو بھی محسوس کی تھی، خیر مذکورہ واقعہ کے بعد میں نے حضرت کو ایک خط لکھا اور اس میں اپنی حماقت پر شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے تہہ دل سے معافی کی درخواست کی، آئندہ سال جب حضرت سے ملاقات ہوئی اور میں نے معافی اور معافی نامہ کا تذکرہ کیا تو ایسی طرح دے گئے کہ جیسے وہ معافی نامہ پڑھا ہی نہ ہو؛ حالاں کہ وہ معافی نامہ حضرت کے پاس پہنچا تھا؛ لیکن کیا کیجیے سامنے والے کو شرمندگی اور ندامت سے بچانا اخلاق عالیہ کا حصہ ہے، حضرت نے اسی عادت واخلاق کی ایک مثال پیش کی:

امسال شوال میں دیوبند حاضر ہوا تو دل میں ایک کسک سی محسوس ہوئی کچھ کھوجانے کا شدید احساس ہوا، ایک روز اتفاقاً مولانا سلمان صاحب بجنوری نقشبندی مدیر ماہنامہ دارالعلوم سے ملاقات ہوئی، مولانا حضرت نور اللہ مرقدہ کے گھر تشریف لے جارہے تھے، مجھ سے کہا اگر وقت ہوتو آئیے وہیں بیٹھ کر باتیں کریں گے، موقع غنیمت جان کر ساتھ ہوگیا، حضرت کے اسی ملاقاتی کمرے میں ہم لوگ بیٹھے، میرِ مجلس کے بغیر مجلس کی رونق وروشنی کیا ہوتی ہے، جو ہوگی ہر طرف غم واداسی کا منظر تھا، کمرے کی ہر چیز بزبان حال کہہ رہی تھی

ہمیں جب نہ ہوں گے تو کیا رنگِ محفل
کسے دیکھ کر آپ شرمائیے گا

حضرت کے صاحب زادے مولانا سعدان صاحب سے ملاقات ہوئی، انھوں نے اپنے والد کے انداز کی ضیافت فرمائی اور حضرت کی یادوں کو تازہ کیا۔

اِس سے پہلے بغرضِ ایصال ثواب مزارِ قاسمی گیا، قبرِ اطہر کی زیارت کی، حسبِ توفیق ایصالِ ثواب کیا، دل تڑپ گیا غموں کے بادل چھاگئے، پچھلے سال حضرت بقیدِ حیات تھے، ابھی فروری میں مدراس فقہی سمینار میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا، آج سب کو رلا کر تڑپا کر محوِ خواب ہیں، واقعی موت واحد ایسی حقیقت ہے جس کو لوگ افسانہ سمجھا کرتے ہیں؛ جبکہ وہ کسی کو بھی کسی وقت آدبوچتی ہے، حضرت کی قبر پر ایک شعر لکھا ہوا پایا جس میں واقعیت وعبرت کا کافی سامان ہے۔

آفتابِ علم ہے اور خاک کی آغوش ہے
آہ اقدارِ سلف کا پاسباں خاموش ہے

راقم الحروف کو حضرت الاستاذ کی ایک چیز بہت متاثر کرتی تھی، وہ یہ کہ حضرت کہنہ مشق شاعر ہونے کے باوجود شعر وشاعری کو اپنا مشغلہ بنانے کے بجائے، درس وتدریس اور بالواسطہ یا بلا واسطہ تصنیف وتالیف کو پیشہ بنائے ہوئے تھے، شعر وشاعری کے مزاج کو ہمیشہ مغلوب رکھا، درس وتدریس کے مذاق کو نمایاں رکھا، بحیثیت ایک مدرس کے مجھے یہ چیز بہت اچھی اور قابلِ تقلید لگتی تھی، آج واقعہ یہ ہے کہ مدارس میں بہت سے اساتذہ نے درس وتدریس کو ثانوی حیثیت دے

رکھی ہے، دیگر مصروفیات کو اولیں درجہ دیا ہوا ہے، جس کا نقصان جگ ظاہر ہے۔

حوصلہ افزائی و ذرہ نوازی:

ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ کی بات ہے، میں نے اپنی کتاب ''اسلام کا نظامِ سلام و مصافحہ'' کے لیے حضرت سے تقریظ لکھنے کی درخواست کی، حضرت کا انتخاب، میری ان سے قلبی عقیدت ومحبت کا نتیجہ تھا، حضرت نے ضعفِ بصارت کے باوجود خود اپنے قلم سے ایک مختصر مگر جامع تقریظ لکھ کر عنایت فرمائی جو میری کتاب کے لیے باعثِ زینت ہونے کے ساتھ ایک ناتجربہ کار اور کم علم مولف کی حوصلہ افزائی کا ذریعہ تھی، مزید براں جب کتاب چھپی تو کسی دوسرے صاحب نے میری کتاب ان تک پہنچادی، مجھے اس کا علم نہیں تھا، شوال میں جب دیوبند حاضری ہوئی، میں کتاب لے کر حضرت کے پاس پہنچا، دیکھتے ہی پہچان گئے اور کہا اچھا سلام والے ہیں، بھائی تم نے تو تفصیلی کتاب لکھ ڈالی، اگر مجھے معلوم ہوتا کہ کتاب اتنی ضخیم ہوگی تو میں لمبی تقریظ لکھتا، مزید فرمایا :اس جمعہ کو خانقاہ مسجد میں مجھ سے تقریر کا مطالبہ ہوا تو میں نے تمھاری کتاب دیکھ کر تقریر کردی، یہ حوصلہ افزائی کا ایسا انداز تھا جو اپنے اندر درسِ عبرت کا وسیع مفہوم رکھتا ہے، حضرت میں حقیقت بیانی کی صفت بھی خوب تھی، بے جا تعریف اور بے جا تنقید کے عیب سے خالی تھے، کہنے لگے بیٹے! کتاب کی ضخامت تمھارے مقصود کے خلاف ہے، کیوں کہ تمھارا مقصد یہ ہے کہ لوگوں میں سلام کرنے کا رواج عام ہو؛ لیکن اتنی ضخیم کتاب عموماً لوگ عمل کے جذبہ سے نہیں پڑھتے، کتاب ۵۰۲ صفحہ کی ہے۔

ذرہ نوازی کا ایک واقعہ اور پڑھیے، دارالعلوم حیدرآباد میں غالباً ششماہی کی تعطیل میں ایک دوست کے ہاتھ حضرت کے لیے نہایت معمولی ہدیہ بھیجا، حضرت نے قبول فرمایا اور دعاؤں کے ساتھ حضرت نانوتویؒ کی ایک کتاب ''قبلہ نما'' بھجوائی، خرد نوازی کے اِس واقعہ سے راقم بے حد مسرور ہوا اور یہ سوچنے لگا کہ بڑے لوگ بلاوجہ بڑے نہیں ہوتے، اِسی طرح ایک مرتبہ ایک دوست کے واسطے سے اپنی اہلیہ کے لیے دعاءِ صحت کی درخواست کی، حضرت نے نہ صرف یہ کہ دعا فرمائی؛ بلکہ اپنے ہاتھ سے کچھ یونانی دواؤں کا نام اور طریقۂ استعمال لکھ کر بھیجا، بیتے دنوں کی یہ وہ یادیں ہیں جو

حافظہ کا حصہ ہیں، یادوں کے یہ اجالے، ہمیشہ چراغِ رہ گذر کا کم دیتے رہیں گے۔

اپنا احساس:

حضرت الاستاذ میں تدریس کا رنگ یقینا غالب تھا، انھوں نے تدریس کو مضبوطی کے ساتھ تھاما تھا، اِسی لیے ان کا اندازِ تدریس سب سے نرالا تھا، بات سے بات نکالتے چلے جاتے تھے، ادب میں البلاغۃ الواضحہ کا درس بڑا ہی دلچسپ ہوتا تھا، پورے سبق میں طلبہ کو ایسا مصروف رکھتے کہ طلبہ خود ہی کتاب حل کر لیتے تھے، ایک با کمال مدرس کی پہچان ہے کہ وہ دورانِ درس طلبہ کو مصروفِ عمل رکھے، زبان میں ایسی چاشنی تھی کہ مزہ آجاتا تھا، تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کا صاف ستھرا ذوق تھا، تحقیقی مزاج کے مالک تھے، علم میں "عُمق" زیادہ تھا، فخر المحدثین حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب کا بخاری شریف کا سبق حضرت کی تحقیق وتعلیق کے ساتھ شائع ہو رہا ہے، یہ کتاب "ایضاح البخاری" آپ کی وسعت علم، گہرے مطالعہ اور حدیث پر اچھی نظر رکھنے کا پتہ دیتی ہے، شوریٰ کی شرعی حیثیت آپ کی تحقیقی مزاج، منفرد اسلوب اور بلند خیالی کی شاہ کار ہے، حضرت مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوریؒ لکھتے ہیں:

> اِس کتاب کے مصنف جناب مولانا ریاست علی صاحب بجنوری مدرس وناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند نے نہایت تحقیق وتلاش سے ان مسائل پر سیر حاصل بحث کی ہے اور کتاب وسنت، فقہ وفتاویٰ اور علماء کے آراء واقوال کے قدیم وجدید مأخذوں کو کھنگھال کر ایک نہایت سنجیدہ اور باوقار کتاب مرتب کی ہے، شوریٰ اور اہتمام سے متعلق حصہ خاص طور سے مصنف کی تلاش وتحقیق کا شاہ کار ہے۔ (شوریٰ کی شرعی حیثیت، ص ۱۳ :)

اللہ تعالیٰ نے حضرت الاستاذ کو شعر گوئی کا ملکہ بھی خوب عطا فرمایا تھا، حضرت نے ادب کی راہوں پر یقینا نئے پھول کھلائے ہیں، ترانۂ دارالعلوم حضرت کی آسان، روح پرور شاعری کا بے مثال نمونہ ہے، ہر مصرعہ اور شعر میں صدیوں کی تاریخ اور حقائق وروایات کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے، آپ کس پائے کے شاعر تھے، اِس کیلئے ایک اقتباس پڑھیے : مولانا لقمان الحق صاحب فاروقی مرحوم سابق شیخ

الحدیث امدادالاسلام میرٹھ وسابق مدرس دارالعلوم دیوبند ''نغمہ سحر'' میں لکھتے ہیں:

ادبِ اردو کے بے استعدادی، بے ہمتی اور کم نگاہی کے اس دور میں بھی کبھی کبھی کوئی شخصیت اس طرح سامنے آجاتی ہے کہ جیسے قدرت نے اسے اجنبیوں کے درمیان کچھ مدت کے لیے بھیج دیا ہو یا پھر یہ کہ یہ کوئی ایسا پھول ہے جو یکا یک صحرا میں کھل گیا ہے اور اپنی رعنائیوں سے لطف اندوز ہوتا ہوا ایک روز خود ہی شریک قافلۂ بہار ہو کر رخصت ہوجائے گا یا پھر یہ کوئی ایک چراغ ہے جو خود بخود جل اٹھا ہے؛ لیکن حد نظر تک اس چراغ کے سوا اور روشنی کے کوئی آثار نہیں یا پھر یہ کوئی ایسی کشتی ہے جو ایک متلاطم اور موّاج محیطِ اعظم میں تنہا اندھیری رات میں بہتی چلی جارہی ہے۔

ریاست علی ظفر بجنوری ادبِ اردو کی سرزمین پر ایسے ہی لالۂ صحرائی یا شعر وسخن کے بحر متلاطم میں ایک تنہا کشتی کی طرح ہیں، انھوں نے علماء دیوبند کی طرح شعر وسخن کو زندگی کے کسی موڑ پر مشغلہ کے طور پر اختیار نہیں کیا؛ لیکن اس کے باوصف قطعات، رباعیات اور غزلوں اور نظموں کا یہ دل آویز مجموعہ ادبِ اردو میں ایک وقیع اضافہ سمجھا جائے گا۔ (نغمہ سحر، ص۹:)

اب جبکہ حضرت مولاناؒ کی شاعری کا تذکرہ زیر قلم آہی گیا چند اشعار بطور نمونہ کے لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے، حمد ہو یا نعت، غزل ہو یا ترانہ : حضرت نے ہر موضوع پر دادِ تحسین حاصل کی ہے؛ لیکن محبت کے مضمون کا ایسا دلنشیں اور حقیقت پسندانہ تجزیہ اور تعریف، حقیقی اور مجازی محبت کا تقابل اِس انداز سے پیش فرمایا ہے کہ وہ اشعار پڑھنے کے بعد مجھ جیسے بے ذوق طالب علم بھی عش عش کرنے لگتا ہے۔

محبت ماورائے این وآں ہے ☆ محبت حاصلِ کون ومکاں ہے

محبت عام ہے سارے جہاں پر ☆ محبت کے لیے سارا جہاں ہے

محبت سے بشر محسودِ کوکب ☆ محبت کی زمیں بھی آسماں ہے

محبت دیدۂ ظاہر سے پنہاں ☆ محبت چشم باطن پر عیاں ہے

محبت ابتدائے جذب ومستی ☆ محبت انتہائے عارفاں ہے

محبت شعلہ بار وشعلہ پرور ☆ محبت لذتِ دردِ نہاں ہے
محبت انصرام وضبط عالم ☆ محبت ارتباطِ قلب وجاں ہے
محبت سے جبین چرخ زرتاب ☆ محبت سجدہ گاہِ کہکشاں ہے
محبت ہے ہمارا ذوق سجدہ ☆ محبت ان کا سنگِ آستاں ہے

محبت کی مثبت حقیقت بیانی کے بعد اخیر میں موجودہ دور کے تناظر میں محبت کی منفی معنویت کو کچھ یوں بیان کیا ہے:

ہوس کہلا رہی شاعروں سے محبت ایک سعی رائیگاں ہے
(نغمۂ سحر، ص۱۱۶:)

حضرت کی دوراندیشی کے تعلق سے ایک اقتباس پڑھیے :مولانا نسیم اختر شاہ قیصر صاحب رقم طراز ہیں:

مولانا دوراندیشی، دوربیں اور بیدار ذہن کے مالک ہیں، ہر معاملہ کے اطراف وجوانب پر نظر رکھتے ہیں، بات کہاں سے چلی اور کہاں تک پہنچے گی فوراً سمجھ لیتے ہیں، قوت فیصلہ بھی خوب ہے، رائے اور مشورہ بڑا نکھرا اور ستھرا ہوتا ہے، معاملہ فہم، معاملہ شناس، ان کی نگاہیں وہاں سے آگے بھی کام کرتی ہیں جہاں دوسروں کی آنکھیں کام کرنا چھوڑ دیتی ہیں۔(جانے پہچانے لوگ، ص ۶۳:)

اللہ تعالیٰ حضرت کو اپنی شایانِ شان بدلہ عطا فرمائے اور دارالعلوم دیوبند کے اِس بڑے خسارے اور خلا کو پر فرمائے اور ہمیں ان کے نقش قدم کا راہی بنائے، آمین۔

اکیلا ہوں مگر آباد کر دیتا ہوں ویرانہ
بہت روئے گی میرے بعد میری شامِ تنہائی

☆☆☆

منظوم

ریاستِ علم وفن کے تاجدار

استاذ الاساتذہ، فخر المدرسین، شہنشاہِ قلم حضرت مولانا ریاست علی صاحب ظفرؔ بجنوری علیہ الرحمہ

مولانا ولی اللہ ولی بستوی

آہ مولانا ریاستؔ علم و فن کے تاجدار ☆ ازہرِ ہندوستاں کے پیکرِ عزّ و وقار
حاملِ علم و عمل تھے صاحبِ فکر و نظر ☆ علم وفن کی سلطنت کے وہ رہے ہیں شہریار
نازشِ دوراں رہے ہیں تابشِ ماہ و نجوم ☆ مادرِ علمی کے تھے سرمایۂ صدافتخار
نکتہ رس نبّاضِ ملت قائدِ اہل ہنر ☆ وہ فراست کی ریاست کے تھے اہلِ اقتدار
کیا حلاوت تھی بیاں میں؟ چاشنی گفتار میں ☆ مینہ برساتی حِکَم کے تھی زبانِ دُرفشار
صاحبِ انشاء رہے ہیں ماہرِ شعر و سخن ☆ دامنِ قرطاس پر اُن کا قلم تھا زر نگار
جو نکلتا تھا زباں سے مستند ہوتا رہا ☆ صاحبانِ علم کو اُن پر رہا ہے اعتبار
آبیاری گلشنِ اسلام کی کرتے رہے ☆ مادرِ علمی کے وہ سچے رہے ہیں جاں نثار
میکشوں کے ساتھ وہ کرتے رہے اچھا سلوک ☆ علم وفن کے طالبوں کے وہ رہے ہیں غمگسار
آنے والوں کے لئے اُن کا تھا دروازہ کھلا ☆ اُن کے میخانے سے بہرہ ور رہے ہیں میگسار
مادرِ علم و ہنر کا ہے ترانہ بے مثال ☆ تھے نکاتِ علم وفن اُن کے قلم سے آشکار
حلقۂ تدریس میں ہوتے رہے سب باریاب ☆ درس کا انداز ہوتا تھا بڑا ہی شاندار
کیا رہی شیریں زبانی کیا رہا طرزِ خطاب ☆ اور پھر تفہیم کا ملکہ ملا تھا جاندار
پاس جو بیٹھا بہت ہوتا رہا محظوظ وہ ☆ مجلسِ علمی ہوا کرتی تھی اُن کی مشک بار
مجلسِ علمی میں اُن کی جی بہت لگتا رہا ☆ اِستفادہ کر رہے تھے لوگ آ کے بار بار
اِس طرح کا حاملِ اوصاف اب پائیں کہاں ☆ اُن کی ہستی مغتنم تھی اور تھی روشن منار
اُن کی نظروں میں نہ تھی اپنے پرائے کی تمیز ☆ اُن کے علمی خوان سے تھے خوشہ چیں اہلِ دیار
تھے مدرس باہنر وہ ماہرِ علمِ حدیث ☆ ایکتا تھے علم و فن میں اور فخرِ روزگار
تھا زمانے کے اکابر میں بڑا اعلیٰ مقام ☆ عبقری اشخاص میں ہوتا رہا اُن کا شمار
وہ گئے تو علم کا گلزار سونا ہوگیا ☆ اُن کی رحلت سے ہوئیں آنکھیں ہزاروں اشکبار
اُن کی نعشِ پاک پر تھا عاشقوں کا ازدحام ☆ تھا بپا چاروں طرف ہنگامۂ چیخ وپکار
ہر کوئی بیتاب تھا خود پر کوئی قابو نہ تھا ☆ ہر کوئی چھوٹا بڑا لگتا رہا سینہ فگار
دیکھنے کے واسطے دوڑے ہوئے جاتے تھے لوگ ☆ جو کوئی پہنچا وہاں وہ رو پڑا بے اختیار
چار جانب تھی زبانوں پر صدائے آہ آہ! ☆ پھوٹتی تھی ہر طرف سے اک صدائے اضطرار
ہے ولیِؔ ناتواں کی بس دعائے دل یہی ☆ بخش دے مرحوم کو اے خالقِ لیل و نہار